لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز اردو بازار
دہلی

- پہلی اور آخری اشاعت۔ (کیونکہ اردو زبان میں شائع ہوئی ہے)
- تعداد اشاعت ——— (ناقابل بیان)
- قیمت ——— بطور مہنگائی الاماں
- امراء ڈی لکس ایڈیشن کا انتظار کریں)
- سالِ اشاعت ——— اردو کا آخری دور ۱۹۷۵ء
- کمال پرنٹنگ پریس دہلی صرف ۱/۲ چھپا

خدا کے نام ——

جو مجھے دنیا میں بھیج کر شرمندہ ہے!

کچّا چِٹّھا

صفحہ

صفحہ

فقط ہنسوڑ نہیں! ——

فکر تونسوی —— اُردو ادب میں طنز و مزاح کے عظیم فن کار ہیں۔ ان کے طنزیہ مضامین اور مزاحیہ خاکے نہ صرف انسانی فطرت کی بوالعجیوں کی آئینہ داری کرتے ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے سماجی مسائل اور ان سیاسی اور اقتصادی طاقتوں کی گہری سوجھ بوجھ کا اظہار کرتے ہیں جو ہمارے سماج میں تباہی اور پستی کی ذمے دار ہیں۔

—— فکر تونسوی آپ کو محض ہنسانے کے لئے نہیں ہنساتا بلکہ وہ اپنے گہرے تجزیہ سے آپ کو مجبور کرتا ہے کہ آپ بیٹھ کر سوچیں اور اپنے گرد و نواح کی دُنیا پر نظر ڈالیں، وہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو سماجی مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ہمارے زمانے کی پیچیدگیوں کا شعلہ بار تجزیہ کرنے میں مشہور ہیں!

کرشن چندر

دھرتی کا باسی ——

فکر تونسوی —— اُن گنے چُنے ادیبوں میں سے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے طنز و ظرافت کا دُور رس ادراک عطا کیا جاتا ہے۔ وہ گذشتہ تین دہائیوں سے لطیف مزاحیہ رنگ میں لکھ رہے ہیں اور اُردو طنز و مزاح کی دُنیا میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا ہے!

انحطاط اور پستی کے موجودہ دَور میں اپنے ذہن و دل کو پُر سکون رکھنا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آج کے زمانے میں سماجی قدروں کی طرح ادبی قدریں بھی درہم برہم ہو رہی ہیں۔ ان حالات میں طنز و مزاح، سماج اور سیاست پر نکتہ چینی کرنے کا مؤثر حربہ بن جاتا ہے اور فکر تونسوی نے اس مقصد کے لئے اس حربے کا خُوب استعمال کیا ہے۔ ان کے مضامین "پیاز کے چھلکے" کے مزاحیہ کالم، ریڈیائی اور سٹیج ڈرامے، سوسائٹی کی ریاکاری، تفاوات، اور مہملات کی زندگی کے معمول کو ہی نہیں اُبھارتے بلکہ ہمیں اپنی پریشانیوں اور خامیوں پر ہنسنے کے لئے بھی مجبُور کرتے ہیں۔ ان کی "بدنام کتاب" آج کی سماجی اور سیاسی زندگی پر مسلسل قہقہہ اور طنز ہے جس سے ہمارے سماجی اور سیاسی خداؤں کو کچھ سوچنے پر مجبُور ہونا چاہیئے۔

—— فکر تونسوی نے اپنی پختگی اور شعور کے مراحل بتدریج طے کئے ہیں۔ ان کو اپنے مزاحیہ اور طنزیہ آرٹ کا مقام ڈھونڈنے کے لئے کچھ

وقت صرف کرنا پڑا ۔ لیکن اپنا مقام ڈھونڈ لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے اپنی بلندی کو برقرار رکھا ـــــ فکر تونسوی نے شوکت تھانوی اور عبدالمجید سالک کی خوشگوار روایات کو ایک نئی تجدید عنایت کی ہے ۔ ان کا طنز و مزاح ـــــ پطرس کی طرح نہ دانش وروں کے لئے ہے اور نہ رشید احمد صدیقی کی طرح صرف رئیسوں کے لئے ہے بلکہ ان کا اسلوب منفرد ہے ۔ وہ زمین پر ہی رہتے ہیں ۔ ان کے لئے آسمان پر پرواز کرنے کی بجائے زمین پر سیدھے چلنا زیادہ اہم ہے ۔ آپ کا مزاح عام انسان کے لئے ـــــ راست، سیدھا، توانا اور بے باک ہے ۔ ان کی زبان منفرد اور اکھری ہے ـــــ تیز، تیکھی، مؤثر اور بعض اوقات تلخ ـــــ لیکن ان کی زبان زیادہ تر قہقہوں اور شگفتگی سے بھرپور ہے ۔ ان کے نزدیک ہمارے بیمار سماج کی پرتیں، پیاز کے چھلکوں کی طرح ہیں کہ ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں اور وہ پیاز کے یہ چھلکے اتارتے رہتے ہیں اور مسلسل اتارتے چلے جا رہے ہیں ۔ ان کے نزدیک، ہمارا ہر عمل مزاح کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے مزاح ہی ان کا اوّل و آخر رجحان ہے ۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ فکر تونسوی زندگی کے اہم مسائل کو ہی ہمیشہ ترجیح اور اولیت دیتے رہیں گے !

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

فکر تونسوی نے الیکشن لڑا

الیکشن میں ہار جانے کے بعد فکر تونسوی صاحب اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی گمشدگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے سورہا ہے جمنا میں ڈوب مرے، کسی نے کہا میں نے انہیں ہمالیہ کی طرف ٹپ ٹپ بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ہاپوڑ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگ رہے تھے اور زار و قطار رو بھی رہے تھے۔

البتہ ایک قرض خواہ جب ان کا سامان قرق کرانے پہنچا تو تلاشی کے دوران اُن کا ایک مضمون بھی ملا جو اُنھیں رسوا کرنے کے لئے ذیل میں شائع کیا جارہا ہے:

" اچانک میرے بارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ یہ افواہ سن کر میرے سُسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا۔ کافی ہاؤس میں میرے دو دوستوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ایک چور نے

ٹیلیفون پر مجھ سے شکایت کی کہ ہم تو تمہیں تلاش سمجھ کر تمہارے گھر نقب نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ الیکشن کے لئے روپیہ کہاں سے آگیا؟ میرے ایک مخالف امیدوار نے ایک کافر ادا حسینہ کو میرے پاس بھیجا تاکہ وہ میرے تقدس کو تار تار کر سکے۔ پڑوسیوں نے ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی کہ محلے کے اس واحد بھلے آدمی کو روکا جائے اور اگر نہ مانے تو اسے اغوا کر لیا جائے۔

درحقیقت ہوا یوں کہ جب ملک میں عام چناؤ کی چرچا چلی تو مجھے شرارت سوجھی کہ مندر کے مہنت رنچھوڑ داس کو چناؤ لڑنے پر اکسایا جائے کیونکہ ایک تو اس کے پاس چڑھاوے کے ہزاروں روپے وافر پڑے تھے جنہیں ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ذہنی مطالعہ ایک گنگارام اور بھجنوں کے سستے ایڈیشن والی کتاب سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اسے کامیاب بنا کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہماری پارلیمنٹری جمہوریت کس حد تک گر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا ـــــ

"مہنت جی! ملک کی جمہوریت خطرے میں ہے! اسے بچانے کے لئے آپ چناؤ لڑیئے!"

مہنت بولا: "ہی ہی ہی"

میں نے کہا: "ہی ہی کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"شرمندہ تو وہ شر ہوں گے۔ آپ کھڑے تو ہو جائیے۔"

"نہیں، آپ مجھ سے زیادہ قابل ہیں آپ کھڑے ہو جائیے!"

"مگر قابل آدمی کے پاس موٹر کار نہیں ہے۔"

"میری موٹر کار حاضر ہے۔"

"روپیہ بھی نہیں ہے۔"

"بھگوان دے گا۔"

"بھگوان کا ایڈریس میرے پاس نہیں ہے۔"

"وہ میرے پاس ہے ؟"

"تو آپ اور بھگوان مشورہ کر کے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔"

میں تو یوں مذاق میں ٹال کر چلا آیا لیکن دوسری شام کو سارے علاقے میں ایک قد آدم پوسٹر چسپاں پایا گیا کہ مہنت رنچھوڑ داس اور اس کے دو ہزار چار سو بیس عقیدت مند بھگتنیوں کی طرف سے شری تونسوی کو الیکشن میں کھڑا ہونے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور فرمالی ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے مذاق سمجھا۔ میرے سسر نے میری بیوی کو ماتمی تار بھیجا لیکن اس کے باوجود میری بیوی نے سارے محلے میں لڈو بانٹے۔ کیونکہ وہ بھی مہنت رنچھوڑ داس کی چیلی تھی۔ جب اپنی بیوی ہی مہنتوں کے بس میں ہو تو پولٹیکل سوجھ بوجھ بے معنی ہو جاتی ہے۔

جس روز کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی، میں صبح ہی صبح باتھ روم میں جا چھپا۔ لیکن میری بیوی اور احباب نے سپیشل پولیس سکواڈ کو بلایا اور اس کی مدد سے دروازہ توڑ کر مجھے باہر نکالا۔ باتھ روم کے باہر آتے ہی ایک دوست نے الیکشن فنڈ کے لئے اپیل جاری کر دی اور گیارہ روپے بھی دے دئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار روپے اکٹھے ہو گئے جن میں پچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ ان پچانوے روپوں میں دو تین نوٹ پھٹے ہوئے تھے۔

اس پر پراپیگنڈہ مشینری فوراً حرکت میں آگئی اور دو ٹروں پر کنوسنگ

سے پہلے مجھے کونسلنگ کی گئی۔ ایک دوست نے کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ کامیاب ہونے کے بعد تمہارے وزیر بننے کے چانس خاصے روشن ہیں۔ ایک جیوتشی کو بلایا گیا۔ جس نے پانچ روپے لے کر زائچہ بنایا، کہ قسمت کے ستارے میں ایک کار اور کوٹھی صاف بیٹھی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ڈیری اونرز یونین کے پریذیڈنٹ شری نیت رام نے پانی ملا ہوا دودھ کا گلاس میرے منہ سے لگاتے ہوئے کہا "الیکشن میں دودھ کا سارا خرچہ میرے ذمہ!" ایک اور صاحب نے وعدہ کیا کہ الیکشن آفس کے لئے میری کوٹھی حاضر ہے! (یہ کہنے کے بعد وہ صاحب کبھی نظر نہ آئے!)۔

ان حوصلہ افزائیوں نے میرا ایمان متزلزل کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ الیکشن لڑنا شرفاء کا کام نہیں۔ لیکن اب خیال آیا کہ صرف شرفاء ہی کو الیکشن لڑنا چاہیئے ورنہ ڈیموکریسی غنڈہ گردی کا شکار ہو جائے گی ——— اس لئے جونہی میں نے ہامی بھری، ہمت میں ایک عجیب سی احمقانہ طمانیت بھر گئی۔ اور ایک مشٹنڈے سے نوجوان نے۔ جو رام لیلا میں راون کا پارٹ ادا کرتا تھا، مجھے پکڑ کر کندھے پر بٹھا لیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سیتا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔

دوسری رات کو احباب نے ایک ایمرجینسی میٹنگ بلائی۔ پچاس دوستوں نے وعدہ کیا تھا لیکن صرف پچیس شامل ہوئے۔ باقی پچیس میں سے کوئی خود بھاگ گیا تھا، کسی کی بیوی بھاگ گئی تھی، اور کسی کی بھینس! ایک لیڈی ملکہ جو ایک بار جوئے کے جرم میں گرفتار ہو چکی تھی اس میٹنگ میں شامل ہوئی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر جو فیملی پلاننگ اور اسقاطِ حمل دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی تھی۔

میری مدّاح نکلی ۔ الیکشن کے ایک گھاگ ماہر شری بدلی چندجی نے اس میٹنگ کی رہنمائی کی ۔ یہ صاحب چار بار الیکشن لڑچکے تھے جن میں سے تین بار ہار گئے تھے اور چوتھی بار ایک ٹکنیکل غلطی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے تھے ـــــ

بدلی چند جی نے ہتواپدیش سے لے کر دیوانِ چرکین تک کے حوالے دے کر بتایا کہ الیکشن میں کس قسم کی حکمت عملیوں سے کام لینا چاہیئے ۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ہر الیکشن پر میری جیب سے صرف پچیس روپے خرچ ہوئے تھے باقی سبھی اخراجات ووٹروں نے برداشت کئے تھے ۔ اس انکشاف کا میری الیکشن مہم پر بہت بُرا اثر پڑا ۔ کیونکہ کئی دوستوں نے اپنے وعدے کے روپے دینے سے انکار کر دیا کہ ووٹر خود برداشت کریں گے اور ایک دوست نے تو اپنے دیئے ہوئے پانچ روپوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا ۔

اس میٹنگ میں ایک ہائی پاور الیکشن کمیٹی بنائی گئی ۔ اس کمیٹی کو تمام اختیارات سونپ دئے گئے کہ وہ جیسے چاہے الیکشن مہم چلائے ۔ پوسٹر نکالے ، نہ نکالے ، جلسے کرے نہ کرے ، مخالف کے جلسوں میں گڑبڑ پھیلائے جلوس نکلوائے ، کرائے پر مظاہرین حاصل کرے ، اپنے امیدوار میں وہ خوبیاں تلاش کرے جو اس میں موجود نہ ہوں اور مخالف امیدوار کے لئے وہ خرابیاں ایجاد کرے جو اس میں موجود نہ ہوں ۔ جعلی ووٹروں کی الگ فہرست تیار کرے جوئے میں سزا یافتہ لیڈی ورکر کو زنانہ ووٹروں کے محاذ کی انچارج بنا دیا گیا ۔ میری ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی جوئے باز محترمہ تھیں کیونکہ یہ جس عورت کے پاس بھی کنویسنگ کے لئے جاتی ، وہ منہ پھیر لیتی اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورتیں ، عورتوں سے کتنی نفرت کرتی ہیں ۔

جب میرے الیکشن کا پہلا پوسٹر نکلا تو کھلبلی مچ گئی ۔ کیونکہ وہ اشتہار

نہیں تھا ایک ادب پارہ تھا۔ اس ادب پارے کو پانچ فی صدی لوگ سمجھے
پچانوے فی صدی نہیں سمجھے۔ میری ضمانت ضبط ہونے کی ایک اور وجہ یہ
پوسٹر تھا جس نے میرے ووٹروں کو پانچ اور پچانوے میں بانٹ دیا اور
دونوں نے مجھے ووٹ نہیں دیا۔ سمجھ داروں نے اپنی سمجھ کے زعم میں اور
ناسمجھوں نے "بے ادب" ہونے کے ناطے! اور جن چند عورتوں نے مجھے ووٹ
دیا۔ ان کی زبانی پتہ چلا کہ انہوں نے مجھ پر رحم کھا کر ووٹ دیا۔ سچ مچ دنیا میں
رحم دل انسان اب بھی موجود ہیں۔

میرا خاکہ اڑانے کے لئے نہیں بلکہ عادتاً مخالف امیدوار نے بھی جوابی
پوسٹر نکالا جس میں مجھ پر کچھ الزامات لگائے۔ مثلاً:-

۱۔ میں کوٹ پتلون پہنتا ہوں۔
۲۔ میری بینائی کمزور ہے۔
۳۔ میں نے محلے کے ایک کتے کو زہر دلوا دیا تھا۔
۴۔ میں نے مندر کی تعمیر کے لئے سو روپیہ چندہ نہیں دیا تھا۔
۵۔ میں دودھ میں طاوٹ کا دشمن ہو کر اپنے بچوں کو دودھ میں پانی ملا کر
پلاتا تھا۔

جب یہ پوسٹر شائع ہوا تو پچانوے فی صدی ووٹروں کی سمجھ میں آسانی
سے آگیا۔ اس پوسٹر نے ذہنی طور پر قریب قریب مجھے مفلوج کر دیا۔ غصے اور
اضطراب سے نیند اڑ گئی۔ الزامات صحیح ضرور تھے لیکن معیاری نہ تھے۔
احباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی مخالف امیدوار پر جوابی الزامات لگا دوں۔
مثلاً یہ کہ اس نے مندر کے تہ خانے میں ناجائز شراب کی بھٹی چلا رکھی ہے، اس
کے والد صاحب نائی تھے، اس کی موجودہ بیوی اغوا شدہ ہے۔ اس کا دادا بخشی

سرکار کا پٹھو تھا یعنی سرکار کا چپراسی تھا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ الزامات میرے الزامات سے بھی زیادہ گرے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ الیکشن نہ لڑوں گا اور ٹانگا ٹیکا چلا جاؤں گا۔ جب میں نے بیوی سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی "میں بھی تمہارے ساتھ ٹانگا ٹیکا چلونگی۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "تو محترمہ! الیکشن لڑنا کیا برا ہے؟"

تیسرے دن ہمارا انتخابی جلوس نکالا گیا۔ میرا انتخابی نشان مرغا تھا۔ ایک صاحب نے تجویز کیا کہ ایک سو ایک مرغے خریدے جائیں۔ ہر مرغے کو بائیسکل کی گدی پر بٹھا کر ان کا جلوس نکالا جائے۔ تجویز بہت اچھوتی تھی۔ لیکن کسی ستم گر نے مرغی خانے کے مالکوں تک یہ اطلاع پہنچا دی تو مارکیٹ میں مرغوں کا نرخ سات روپیے سے دس روپے ہو گیا۔ بیوی نے پیش کش کی کہ میرے طلائی زیور بیچ کر مرغے خرید کر لیجئے۔ میرا گلا بھر آیا۔ قربانی کی یہ مثال صرف انقلابِ فرانس میں ملتی ہے۔ انقلابی سپرٹ کے تحت ایک سو ایک مرغوں کا جلوس برٹسکر دفتر سے نکلا۔ ایک سو ایک بائیسکلیں اور ان پر گدی نشین ایک سو ایک مرغے اور انہیں سنبھالنے کے لئے ایک سو ایک ورکر۔ اس جلوس پر مخالفوں نے پتھراؤ اور حمائتیوں نے پھول برسائے۔ جلوس میں مرغ اور انسان دونوں شامل ہوئے۔ جلوس کے آگے ککڑوں کوں کا ایک ٹیپ ریکارڈ برابر بج رہا تھا اور عوام نعرے لگا رہے تھے ــــــ

جیئے گا بھائی جیئے گا!

مرغے والا جیئے گا!!

جلوس کے خاتمے پر معلوم ہوا کہ دس بائیسکلیں اور پندرہ مرغے غائب ہیں۔ کچھ ورکروں نے بتایا کہ چار یا پانچ مرغے تو مرغیوں کے پیچھے بھاگ گئے۔

کچھ ڈرکر جو بے ایمان تھے، جلوس کے درمیان ہی سے کچھ بائیسکلیں لے کر کھسک گئے۔

تین دن بعد مخالف امیدوار نے بھی جلوس نکالا۔ اس کا انتخابی نشان بھینس تھا۔ انھوں نے بھی ایک سو ایک بھینسوں کا جلوس نکالا ۔ عوام اس جلوس میں بھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوئے۔ ان عوام کا کوئی اعتبار نہیں۔ مرغے اور بھینس دونوں سے یکساں عقیدت رکھتے ہیں۔ عوام کے اس دوغلے پن پر میں کباب ہوگیا۔ صرف ایک بات اطمینان بخش تھی کہ مخالف کی آٹھ بھینسیں غائب ہوئیں جن کی قیمت مرغوں سے سات سو گنا زیادہ تھی۔

اس کے بعد جلوس کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ امر تعجب خیز تھا کہ مرغوں کی طرح مقررین بھی کرائے پر مل جاتے تھے۔ شاعر اور موسیقار ایک جلسے سے فارغ ہوکر دوسرے جلسے میں پہنچ جاتے۔ صرف امیدواروں کے نام بدل دیتے، مواد وہی رہنے دیتے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی یہ "پیسہ پرستی" دیکھ کر کئی بار مجھے شرم آئی لیکن احباب نے سمجھایا کہ یہ صنعتی دَور ہے، یہاں آرٹ بھی بازار کی جنس ہوگیا ہے۔ ہلدی، آلو، ٹماٹر، گڑ اور شعر ——— ان سب میں بھید بھاؤ مِٹ گیا ہے۔

ہمارے حلقے میں چوبیس ہزار ووٹر تھے جن میں سے ڈھائی ہزار ووٹر جعلی تھے یعنی خدا کی طرح موجود تھے لیکن نظر نہیں آتے تھے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے "ان ڈھائی ہزار ووٹروں کا ٹھیکہ مجھے دے دیا جائے۔ ڈھائی ہزار روپیہ لے کر ووٹ بھگتا دوں گا"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی ٹھیکہ مخالف امیدوار سے بھی کر چکا ہے اور ڈھائی ہزار روپے لے چکا

ہے۔ میں نے اُسے بلا کر شرمندہ کیا لیکن وہ شرمندہ نہ ہوا اور کہنے لگا "شرمندگی کیسی ؟ یہ تو بزنس ہے "۔

ایک ہزار ووٹر رحلت فرما گئے تھے جس سے مجھے بہت تسکین ہوئی ۔ کیونکہ ووٹر جتنے بھی کم ہوں اُتنی زحمت کم ہوتی ہے —— ہر ووٹر کے پاس جاجا کر ہاتھ جوڑنا پڑتے ہیں الیکشن کی اصطلاح میں اسے "ڈور ٹو ڈور کنویسنگ" یعنی در در کی خاک چھاننا کہتے ہیں ۔ میں نے کئی ایسے ووٹروں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے جو اندھے تھے ۔ ایسے ووٹروں کو اپنا مینی فیسٹو سنایا جو بہرے تھے اس کنویسنگ میں محلّے کے جو معززین ہمارے ساتھ چلتے وہ مخالف امیدوار کے ساتھ بھی چلا کرتے ۔ ان میں سے ایک معزّز نے مجھے کان میں بتایا کہ ہم صرف اخلاق اور تہذیب کی خاطر مخالف امیدوار کے ساتھ جاتے ہیں ورنہ ہم ووٹ آپ ہی کو دیں گے ۔

اور ان میں سے اکثر معزّزین نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی ووٹ نہیں دیا ۔ پولنگ کے دن یا تو وہ باہر چلے گئے یا تاش کھیلتے رہے ۔

پولنگ سے دو دن پہلے سرگرمیاں کچھ زیادہ تیز ہو گئیں ۔ مثلاً مخالف اُمیدوار کے ایک خاص ایلچی نے رات کے دو بجے آکر میرا دروازہ کھٹکھٹایا ۔

میں نے پُوچھا ۔ "کیا چاہتے ہو ؟"

وہ بولا : "آپ کا ضمیر !"

میں نے کہا : "ذرا وضاحت فرمائیے "۔

اور اس نے بطور وضاحت پانچ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں ڈال دئے ۔ میں نے کلی کی طرح تبسّم کیا اور کہا کہ نرخ بالا کُن —— وہ اُداس ہو گیا بولا —" مالک نے مجھے چھ ہزار روپے دئے ہیں ۔ ایک ہزار روپیہ میں نے بطور کمیشن

رکھ لیا ہے"۔

میں نے یہ سن کر اپنے کتے سے کہا "ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ"۔

دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ تمام سبزی خوروں نے مندر میں جاکر قسم کھائی کہ مرغا ایک طرح کا مانس ہے۔ اس لئے کوئی سبزی خور مرغے کو ووٹ نہ دے گا۔ لیکن مندر کے ہیڈ پجاری نے پچاس روپے میں اپنا ضمیر بیچتے ہوئے بتایا کہ جب قسم کھائی گئی اس وقت بھگوان کی مورتی کو نہلایا نہیں گیا تھا۔ اس لئے قسم کا قبول ہونا مشکوک ہے۔

تیسرا انکشاف یہ ہوا کہ ووٹر کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی بلکہ مختلف ٹولیوں، فرقوں اور برادریوں کی رائے ہی اس کی رائے ہوتی ہے۔ ترکمان برادری، گوالا برادری، جوتے باز برادری، چڑی مار برادری، گائے برادری، کبوتر برادری ——— ! غرض ان گنت برادریوں میں ووٹر حضرات کی تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ میں نے افراد کی بجائے برادریوں سے التجا کی کہ میں بھی آپ ہی کی برادری کا ممبر ہوں۔ ممبر بنانے کے بعد انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم آپ ہی کو ووٹ دیں گے۔ مخالف امیدوارت سے بھی ایسا ہی برادرانہ وعدہ کیا گیا۔

اور سب سے آخری اور عظیم انکشاف یہ ہوا کہ جب پولنگ کے بعد ووٹوں کی گنتی کی گئی تو میری بیوی کے سوا کسی کو یقین نہ آیا کہ میری ضمانت ضبط ہو گئی ہے۔ لیکن مجھے برابر شک رہا کہ میری بیوی نے بھی مجھے ووٹ نہیں دیا۔ بد نیتی سے نہیں، لاعلمی سے !!
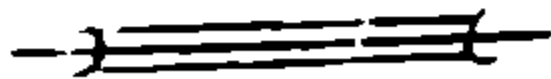
مشاعرے میں صدارتی خُطبہ

معزز حاضرین اور ان کے اطفالِ کرام !

آپ نے مجھے اس مشاعرے کی صدارت کا اعزاز عطا فرما کر حماقت کا ثبوت دیا ہے یا ذہانت کا میں نہیں جانتا لیکن گذشتہ کئی دنوں سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ مجھ سے کوئی نہ کوئی نازیبا حرکت سرزد ہونے والی ہے ایک خوف یہ بھی تھا کہ شاید مجھے کسی قبر کا مجاور بنا دیا جائے گا' یا کسی اجتماع کی صدارت سونپ دی جائے گی ۔ جیسے گائے بانجھ ہو جائے تو اسے گئوشالہ میں دان دے دیتے ہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر' شاعری ترک کر دے تو اُسے کان سے پکڑ کر مشاعرے کی صدارتی کرسی تک پہنچا دیتے ہیں ۔

بھائیو ! اس "گئو رکھشا" پر میرے ساتھ ہمدردی کیجئے !

پرسوں کی بات ہے ۔ یہی سکریٹری صاحب جو مرغابی کی طرح گردن پھلائے

خوش خوش نظر آ رہے ہیں میرے پاس ماتمی چہرہ لئے ہوئے تشریف لائے اور بولے ــــــ "فکر صاحب! براہ کرم آپ ہمارے مشاعرے کی صدارت قبول فرمائیے!"

میں نے کہا ــــــ "مگر آپ نے تو جناب بقل بلورا صاحب کو صدر بنانے کا اعلان کر رکھا ہے۔"

وہ بولے ۔ "افسوس! کہ کل وہ اچانک انتقال فرماگئے!"

سامعین حضرات! میں نے بہت مشکل سے آنسوؤں کو روک کر اسٹیج سکریٹری سے کہا ۔ آپ جس راستے پر مجھے ڈال رہے ہیں وہ سیدھا بقل بلورا صاحب کی طرف جاتا ہے ۔لیکن شعر و ادب کی خدمت کے لئے میں جہنم یا جنت دونوں جگہ جانے کے لئے تیار ہوں ۔ بھائیو! آپ نہیں جانتے کہ میرے جہنم جانے کی پیش کش پر اسٹیج سکریٹری صاحب کس قدر مسرور ہوئے ۔ جو لوگ دوسروں کی خوشی کے لئے مر جاتے ہیں۔ سُنا ہے کہ ان کا جنازہ مشاعرہ گاہ سے سیدھا قبرستان تک پہنچ جاتا ہے اور سامعین حضرات! جب مجھے ایک آراستہ کار میں بٹھا کر اس مشاعرہ گاہ تک لایا جارہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے میں ایک بکرا ہوں اور مجھے قربانی کے لئے قصائی کے پاس لے جایا جارہا ہے ۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے میرے صدر بننے کی تائید فرمائی تھی ۔ آپ کو ان کی تائید سے گمراہ نہ ہونا چاہیئے ۔ یہ ضروری نہیں کہ تائید انھوں نے دل کی گہرائیوں سے کی ہو ۔ نہیں جناب! تائید کرنا ایک عادت ہے جیسے سگریٹ پینے کی عادت، جھوٹ بولنے کی عادت، گالی دینے کی عادت ۔ صرف عادت پر ادبِ عالیہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی ۔ آپ یہ نہ سوچئے کہ انھیں میرا صدر بننا پسند تھا بلکہ ان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ منہ پھٹ نہیں ہیں ۔

جب سے اسٹیج سکریٹری نے میری گردن میں پھولوں کے ہار ڈالے ہیں۔ میں اپنے آپ کو آپ لوگوں سے الگ تھلگ محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں آپ سے زیادہ معزز شخص ہوں۔ اندازہ لگائیے، صرف ۲۵ پیسے کے ہار سے جو انسان معزز بن جاتا ہے۔ سماج میں اس کی عزت ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے کیونکہ پھولوں کا ہار نہایت کمزور بنیاد ہے ـــــ کل آپ میں سے کوئی بھی پچیس پیسے کا ہار خریدکر اپنی گردن میں ڈال لیگا اور کہے گا ـــــ "میں صاحب صدر ہوں ـــــ" اس کا مطلب یہ ہے حضرات! کہ نہ میں معزز ہوں نہ آپ ہیں۔ معزز یہ ہار ہے! اگر ابھی ابھی ایک صاحب پچاس پیسے کے دو ہار پہن کر اسٹیج پر آجائیں اور کہیں کہ میں آپ سے ڈبل معزز ہوں! تو میں صدارت کا بائیکاٹ کر دوں گا۔ کیونکہ یہ اصول کا سوال ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اصول کے لئے لوگ "آتم داہ" تک کر لیتے ہیں۔ عزت یا تو اصول میں ہوتی ہے یا ہاروں میں۔ صدارت میں کبھی نہیں ہوتی۔

جناب! اگر یہ ہاروں والی صدارت کا قصہ آپ کو پسند نہ آیا ہو تو ایک اور صدر کا قصہ سُن لیجئے۔ جس نے صدارت خریدی تھی۔ اُس نے مشاعرے کے منتظمین کو ایک سوا ایک روپیہ چندہ عنایت فرمایا۔ جب وہ صدارت کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے تو صدارتی کرسی پر کوئی دوسرے صاحب تشریف فرما تھے۔ انھوں نے منتظموں کو ایک سو ایک بار جھاڑنے کے بعد پوچھا۔ "یہ کیا نان سینس ہے؟" اسٹیج سکریٹری نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ان صاحب نے ایک سو اکیاون روپے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس لئے ہم انھیں صدر بنانے پر مجبور ہو گئے۔

دوستو! میں ان دردناک حادثوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو

یقین دلا سکوں کہ میں آپ سے زیادہ معزز نہیں ہوں۔ موجودہ صدارت کے دوران مجھے برابر یہ کھٹکا لگا رہے گا کہ آپ میں سے کوئی بھی خود دار شخص اٹھ کر اسٹیج پر آ جائے گا اور کہے گا "شکر صاحب! کرسیٔ صدارت خالی کیجیے" اس پر میں بیٹھوں گا! کیونکہ میرا بنک بیلنس آپ سے زیادہ ہے!

لیکن اس کے باوجود جناب! مجھے نہ جانے کیوں یہ امید ہے کہ آپ ایسی اوچھی حرکت نہ کریں گے۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں میری باتیں سن کر آپ کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں اور زرد چہرے کبھی خود دار نہیں ہو سکتے۔

اور شاید اب آپ انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں کوئی صدارتی فرض ادا کروں گا۔ نہیں صاحب! کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے کے بعد صدر اپنے فطری انجام تک جا پہنچتا ہے اور اب میری حالت زیادہ سے زیادہ اس قیدی کی سی ہے جس کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ صدر بن کر تین چار گھنٹے مسلسل کرسی پر معزز بن کر بیٹھے رہنا کتنا ذہنی عذاب ہے! اب میرے پاس اپنا کچھ باقی نہیں رہا، جو کچھ ہے، آپ حضرات کا ہے۔ میں آپ کی تمناؤں کا غلام بن کر کرسی پر حاضر ہوں گا کرسی پر ہلکی سی کروٹ بھی لوں گا تو آپ سوچ لیں گے کہ صاحبِ صدر بور ہو رہے ہیں اور بور ہونا صدارت کی شان کے شایاں نہیں۔ میرا سگریٹ سلگانا بدتمیزی سمجھا جائیگا میز پر عینک اتار کر رکھنا غیر مہذب فعل تصور ہوگا ——— یعنی میں اپنی حالتِ زار پر نہ رو سکوں گا، نہ ہنس سکوں گا۔ جناب! میں سانس تک نہ لے سکوں گا! ورنہ شعراء حضرات سمجھیں گے میں انھیں ہوٹ کر رہا ہوں۔ اب میں آپ کی آنکھیں بچا کر ہی انگڑائی لے سکوں گا۔ اگر تازہ ہوا کے لئے دو چار منٹ کے لئے کھلی فضا میں جاؤنگا تو آپ سمجھیں گے مشاعرہ ختم

ہو گیا ہے ۔

ہاں میرے پیارے دوستو ! میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا ۔ جو انسان کی معصوم اور بھولی بھالی فطرت سے تعلق رکھتی ہوگی ۔ آہ ! آپ نے ایک نیچرل انسان کو ان نیچرل بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ آپ نے میری عزّت کی ہے ۔

ابھی ابھی آپ کے سامنے بڑے بڑے مقتدر شعراء اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لئے تشریف لائیں گے ۔ جب سے شاعری نے جنم لیا ہے میرا اور آپ کا یہ اندھ وشواس رہا ہے کہ شاعری آسمان سے اترتی ہے اور شعراء حضرات پیغمبر ہوتے ہیں ۔ ایک بار میں نے پیغمبر بننے کا تجربہ کیا تھا اور جس طرح کئی تجربے ناکام ہو جاتے ہیں، اسی طرح میرا پیغمبر بننا بھی ناکام ہو گیا ۔ حادثہ یہ ہوا کہ میں آسمان سے جو پیغام لایا تھا، زمین پر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ۔ اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے ۔ ایک بار ایک کوا میری منڈیر پر یہ پیغام لے کر آیا کہ میری محبوبہ آنے والی ہے تو جناب ! میں نے فرطِ مسّرت میں اس کوّے کو پھل کھلائے، چائے پلائی، سگریٹ تک پیش کیا ۔ لیکن اس پیغام کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری محبوبہ کی بجائے کچہری کا بیلف آگیا ۔ جو مجھے سرکاری قرضہ ادا نہ کر سکنے کے جرم میں گرفتار کر کے لے گیا ۔

چنانچہ حضرات ! میری پیغمبری کا بھی یہی انجام نکلا کہ میں کوّے کے پیغام کا مفہوم نہ سمجھ سکا ۔ اس لئے پکڑا گیا ۔ میری شعریت بھی دوسروں کی سمجھ کی غلام تھی، اس لئے ناکام ہو گئی ۔ کیونکہ میں ہتھکڑی کی بات کرتا تھا تو لوگ اسے محبوبہ کی زلفیں سمجھتے تھے ۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ میں شاعر کی بجائے صدر بنا بیٹھا ہوں !

چنانچہ میں نے شاعری ترک کر دی ۔ لیکن ترکِ شاعری کے باوجود میں نے دیکھا کہ شاعری کی عظمت کم نہ ہوئی ۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر دور میں کئی شاعر ایسے ضرور پیدا ہوتے ہیں جو شور مچا دیتے ہیں کہ شاعری کا زوال قریب ہے اسے پھر بلندی عطا کرنی چاہیئے ۔ یہ اوّل درجے کے شعراء کہلانے لگتے ہیں ۔ یہ دیکھ کر دوسرے اور تیسرے درجے کے شعراء بہت پریشان ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کو برباد کرنے کے لئے ان کا مشن فیل ہو رہا ہے ۔ ان میں سے کئی دریا میں چھلانگ لگا کر مرجاتے ہیں اور مرنے سے پہلے دریا کے کنارے پر کاغذ کا ایک پرزہ چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ جاہل دُنیا اس کی عظمت کو سمجھ ہی نہ سکی ۔ لیکن کچھ شعراء جو دریا کے ٹھنڈے پانی سے ڈرتے ہیں، خودکشی نہیں کرتے بلکہ تنقید نگار بن جاتے ہیں ۔ ایسے ہی ایک شاعر نے انتقام لینے کی غرض سے ایکسپورٹ امپورٹ کا دھندا شروع کر دیا اور خوب نام اور دام کمایا ۔ اس طرح ایک اور شاعر نے شاعری سے بدلہ لینے کے لئے "ناشاعری" شروع کر دی جس کے یہ چند مصرعے مجھے ابھی تک نہیں بھولے ــــــــ

میں اپنے والد کی کھجلی کا ایک مسئلہ ہوں ۔
جی میں آتا ہے کہ
اپنے والد کی قبر پر کھڑا ہوں
اور کہوں
مجھ سے اپنی یہ جائداد واپس لے لو
میرے اندر کا جو چوہا ہے، لنڈورا ہی بھلا ۔
اور پھر قبر پر زور سے قے کر دوں
قے! ــــــــ یعنی جائداد لوٹا دوں!

لیکن سامعینِ کرام! شاعر چاہے خودکشی کر لے۔ چاہے کھجلی کا مستہ بن جائے۔ لیکن صرف ایسے ہی شاعروں کی بدولت مشاعروں اور میگزینوں کی رونق قائم رہتی ہے۔ یہ اتنا بڑا سماج جو مزدوروں سے لے کر بیتیم خانوں سے ہوتا ہوا راج محلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو چار عظیم شاعروں کے بھروسے پر نہیں چل سکتا۔ غالب، ٹیگور، اور اقبال سے اس سماج کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غالب اور اقبال کے پیچھے کئی ڈویژن شاعر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ ڈویژن اس مشاعرے میں بھی موجود ہے۔ اگر اس مشاعرے میں صرف ٹیگور ہوتا تو مشاعرہ پندرہ بیس منٹ میں ختم ہو جاتا لیکن اب اللہ کے فضل سے یہ مشاعرہ رات کے تین بجے تک چلے گا۔ بڑے شاعر صرف بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن سماج کو چھوٹی باتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چند دن ہوئے کافی ہاؤس میں دو شاعروں نے ایک دوسرے کے منہ پر کانچ کے گلاس پھینک کر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیا کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو گھٹیا شاعر کہہ رہے تھے حالانکہ دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ ٹیگور گھٹیا شاعر تھا۔

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ شعراء حضرات میرے خطبے سے بور ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہوٹ کرنا شروع کر دیں، میں اسٹیج سکریٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مشاعرے کا آغاز کر دیں اور مشاعرے کی حسین روایت کے مطابق پہلے گھٹیا شاعروں کو مدعو کریں۔ اس کے بعد کم گھٹیا شاعروں کو اور پھر اُن سے کم گھٹیا شاعروں کو !!

قبر سے واپسی

اور پھر مرنے کے ایک ہفتے بعد قبر میں میری آنکھ کھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے ؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا تو میری یہ قبر کیسے بن گئی ہے ــــــ ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لئے کھودی گئی ہو اور موقع پا کر دفن مجھے کر دیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کرنے کے لئے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی ؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائیڈ تھا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا، ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ کس سے تصدیق کرائی جائے کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں ؟ چنانچہ میں نے قبر میں لیٹے لیٹے آواز دی ــــــ

"کوئی ہے ؟"

جواب میں جیسے گنبد کی سی صدا آئی: ——— "کوئی ہے؟"
میں نے پوچھا، "تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟"
جواب آیا، "نہیں! میں فکر تونسوی ہوں"۔
تھینک گاڈ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ بلیک میل نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو قبلہ؟"

"میں تمہارے اندر ہوں"۔

"اندر ہو؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے! تم تو انتقال کر گئے تھے! لوٹ کیوں آئے؟"

جواب میں کچھ سسکیاں سی سنائی دیں، جیسے کوئی نادم ہو، بے حد پچھتا رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ گھر سے لڑ جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد گھر لوٹ آئے اور دیوار سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔

میں نے پوچھا، "رو کیوں رہے ہو فکر تونسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں انتقال کے بعد لوٹ کیوں آئے؟"

وہ بولا: "دراصل غلط فہمی ہو گئی تھی ——— یعنی انتقال میرا نہیں ہوا تھا، تمہارا ہوا تھا۔ میں تو تمہاری روح تھی۔ تمہارے جسم سے نجات پا کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے پنڈ چھوٹا، اب کسی معقول جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ ہفتے بھر تک مختلف جسموں کے دروازے کھٹکھٹاتی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر ایک نواب کے یہاں، ایک سمگلر کے درِ دولت پر ——— یہاں تک کہ ایک مٹھ کے مہنت کے یہاں بھی گئی، مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ سب نے جواب

دیا، "گوبیک! ہم یہ بلا اپنے گلے نہیں منڈھیں گے، جہنّم میں جاؤ"
میں ہنس دیا "تو چلی جائیں جہنّم میں"
وہ بھی ہنس دی "آلو گئی ہوں جہنّم میں۔ فکر تونسوی اور جہنّم، دونوں ایک دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں"
"کتنا غلط ترجمہ ہے!" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "کاش! اس جہنم کا دروازہ کبھی تم پر بند رہتا"
"کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے، غیر تھوڑے ہی تھے! چلو نکلو اس قبر سے باہر چلیں"
اور میں اپنی گھسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی کچی تھی۔ پختہ نہیں کی گئی تھی۔ شاید میرے رشتہ دار اور مدّاح پختہ قبر کے لئے ابھی چندہ فراہم کرنے میں مصروف تھے ——— جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا، دو آدمی جو شاید میری قبر کی مٹی کھود رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی "تم کون ہو بھائیو! میری قبر پر دیا جلانے آئے تھے یا میرا کفن چُرانے؟ اور اب دوبارہ بھی آؤ گے یا یہ تمہارا آخری وزٹ تھا؟"
مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی ——— اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں اُلجھ گیا اور پھر جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا، اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا: "واہ فکر تونسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ بیکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گنّے توڑ لیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے"
مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام

نہیں آسکا، مرنے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم میرا چند گز کفن ہی حاصل کر لیتے اور اگر دیا جلانے والے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ ہی بخش دیتا۔ میری بدولت انہیں کچھ تو مل جاتا ——— مگر آہ! یہاں بھی انہیں فکر تونسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ کچی قبر کی طرح یہ ایک کچی سی تختی تھی، جس پر کچی سیاہی سے تحریر تھا:

"یہاں طنز نگار فکر تونسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا، لیکن اپنی چھوڑی ہوئی حماقتوں کے باعث لافانی رہے گا۔"

"تاریخ پیدائش: جس دن قیصر جرمنی مرا تھا۔

"تاریخ وفات: جس دن کوئی بھی نہیں مرا، سوا فکر تونسوی کے۔

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چرائے گئے ہیں۔ مجھے اپنے مداحوں اور رشتے داروں کے ذہنی افلاس پر بڑا افسوس ہوا کہ وہ میری موت پر دو اوریجنل فقرے بھی نہیں لکھ سکے۔ اگر نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے کم از کم میرے مضمون کا ہی حوالہ دے دیتے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا تھی جس میں قریب کی ایک ربڑ فیکٹری کا کڑوا کسیلا دھواں ملا ہوا تھا۔ یہ فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ چھگن لال نے بنائی تھی وہ اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر آبادی سے دور لے جایا جائے اور یہ قبرستان مجھے الاٹ کر دیا جائے تاکہ میں فیکٹری کو پھیلا کر ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ ربڑ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں سڑاند پیدا کرتی ہیں مگر یہاں لاشوں کے بجائے

ربڑ سڑاندھ پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہبند کی طرح جسم پر لپیٹے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی۔ اردگرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور ان سے کہا:

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شہر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک سٹال پر آج کا اخبار دیکھا۔ خرید نہیں سکا، کیوں کہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پرانی خبریں تھیں ——— گھیراؤ، ہڑتالیں، بھومی چھینو اندولن، کیبرے ڈانس کے اشتہار۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اخبار پڑھ کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑ گئی، جو میرے ایک جیوتشی دوست جناب کھجور انند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا:

فکر تونسوی کا انتقال ——— پیش گوئی سچ نکلی

مشہور جیوتشی آچاریہ جناب کھجورانند جی نے دو برس پہلے طنز نگار فکر تونسوی کی موت کی پیش گوئی کی تھی کہ آپ باون سال اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور قرض خواہوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے یہ پیش گوئی منٹ اور سیکنڈ کی حد تک صحیح نکلی ——— لہٰذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لئے جیوتشی کھجورانند کی خدمات حاصل کیجئے!

اشتہار پڑھ کر میں اُداس ہو گیا ۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آنے پر بے چارے کھجوراننَد کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا ۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لئے واپس آیا ہوں ؟ میں کھجوراننَد سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو !

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے کو اشارے سے روک لیا ——————

"موتی نگر چلو گے ؟"

ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لئے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لئے کہا جائے تو کہے گا، شاہدرہ چلنا ہو تو لے چلوں گا۔ مگر اس سکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنے لگا ۔ میرے بدن پر سستا سا ریشمی کفن بندھا دیکھ کر بولا —— "آپ کون ہیں ؟ یہ مُردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے ؟"

میں نے کہا —— "میں فکر تونسوی ہوں، یہ کفن میرا اپنا ہے، چُرایا ہوا نہیں ہے"۔

"فکر تونسوی ہو ؟" اسکوٹر ڈرائیور گھبرا کر اپنی سیٹ سے اُچھلا —— مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے، اور تم ؟" یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا ۔ شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا ۔ میری حالت بھی کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی ۔ بے ہنگم بڑھی ہوئی داڑھی، سر کی بجائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے ہڈیاں باہر اور آنکھیں اندر ۔ جسم پر جگہ جگہ مٹی لتھڑی ہوئی اور پاؤں سے بھی ننگا (حیرت ہے کہ دفن کرتے وقت مُردے کو جوتا کیوں نہیں

پہنایا جاتا ؟)

تھکن، بھوک، توہین اور اداسی ——— جو عام ہندوستانی کے نصیب میں ہے، میں بھی ان کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بڑی عبرتناک تھی۔ نہ میں اپنے گھر جا سکتا تھا، نہ واپس قبرستان جا سکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا، بلکہ میرے سے جیب ہی نہیں تھی۔ پہلے اپنے آپ کو فکر تونسوی کہہ کر میں کسی بھی دکاندار سے سگریٹ ادھار لے سکتا تھا مگر اب ؟ حالانکہ میں سو فی صدی وہی فکر تونسوی ہوں لیکن کوئی مجھے ایک سگریٹ تک ادھار نہیں دے گا۔ مرنے کے بعد فکر تونسوی اپنا اعتماد، اپنی ساکھ کھو چکا تھا۔ آہ! صرف سات دن میں فکر تونسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا!

تھکا ہارا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی کمیونٹی ہال کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ سیڑھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ماٹو لگا ہوا تھا:

طنز نگار فکر تونسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ ———

رائیٹرز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے

ماٹو پڑھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ موت کے بعد عزت کا کفن پہنانے والے احباب سے ملوں اور ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روؤں اور کہوں، "یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں مت بھرو، کہ میں لوٹ آیا ہوں!"

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا، اور احساس کمتری کے مارے سب سے پچھلی بینچ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر

اداسی اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے سیاہ پردے کے پیچھے سے ایک ماتمی دھن بج رہی تھی۔ کتنی لطیف دھن تھی! ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار ہوتا ہے۔ جی چاہا کہ یہ دھن بجتی رہے ——— بجتی رہے ——— بجتی رہے اور میں مرا رہوں ——— مرا رہوں۔

اتنے میں جلسے کا سکریٹری مائیک پر آیا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ اس نے ایک ادبی میگزین میں ایک مرثیہ لکھا تھا: "فکر تونسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جس دن اس نے طنزیہ مضامین لکھنے شروع کئے تھے" اور میں نے یہ فقرہ پڑھ کر کہا تھا: "اگر یہ فقرہ دل کش نہ ہوتا تو میں اس حاسد شخص کے منہ پہ طمانچہ لگا دیتا!" اب سکریٹری نے رُندھے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا:

"دوستو! مقامِ تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تونسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے، وہ ہمارے طنزیہ ادب کو سُونا کر کے چلا گیا!"

ماتم گسار احباب نے وفورِ جذبات سے داد کی تالیاں بجائیں۔ ایک تالی میں نے بھی بجائی، اور طنزیہ ادب کو سُونا کرنے کے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پہ دو صاحب بیٹھے کھسر پھسر کرنے لگے۔ ایک نے کہا:

"حرام زادہ! بکواس کر رہا ہے! فکر تونسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا!"

دوسرا بولا "اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی امداد کے لئے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے، جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے!"

"ہی ہی ہی! کیوں نہ کرتا؟ یہ خود بھی تو ایک بیوہ ہے!"

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے مرحوم فکر تونسوی کی قدِ آدم تصویر کو ایک پھول مالا پہنائی۔ پھول مالا کی خوش بو اور ملائمت مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ بعض اوقات ٹریجڈی بھی کتنی ملائم اور معطر ہوتی ہے! میں جیسے مستی میں لہرا

سا گیا۔ صدر جلسہ نے پھول مالا پہناتے وقت گلوگیر لہجے میں ایک شعر پڑھا:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار پکار اٹھا: "ملئے ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے"!

میرے ایک انتہائی مدّاح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کشاں کشاں باہر جا کر پھینک آیا۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے ماتم گسار احباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تونسوی کو قریب سے جانتا تھا ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مرحوم کو جب بھی کھانسی ہوتی تھی، مجھ سے ہی گولیاں لے جاتا تھا اور یہ گولیاں ادبی خدمات کے سلسلے میں دی جاتی تھیں۔ ایک جرنلسٹ دوست نے دعویٰ کیا کہ ایک بار مرحوم نے میرے ساتھ شملے تک کا سفر کیا تھا تو اس نے انہیں راستے میں آلوچے کھلائے تھے۔ ایک پبلشر نے تین فقروں میں تین بار ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تین بار اس بات کا ذکر کیا۔ مرحوم اپنی موت سے کچھ دن پہلے مجھ سے ایک سو روپے اُدھار لے گئے تھے اور ان سے اپنی قمیص پتلون سلوائی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مرحوم کا میموریل ہال بنایا جائے تو اس پتلون قمیص کو میری خاص یادگار کے طور پر اس میں ضرور رکھ دیا جائے"!

میرا جی چاہا کہ اُٹھ کر اس پبلشر کا پردہ چاک کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش بیٹھا رہا کہ مرحوم لوگوں کا اعتبار کون کرتا ہے؟

ایک اور صاحب اُٹھے۔ وہ انتہائی گھٹیا شاعر اور انتہائی امیر آدمی تھے۔ وہ

بڑے طیش میں تھے۔ میز پر مکا مارتے ہوئے گرج کر بولے:۔۔۔۔" میں۔۔۔
میں۔۔۔۔۔ میں ساہتیہ اکیڈمی سے پوچھتا ہوں کہ مرحوم کو ادبی ایوارڈ کا مستحق کیوں نہیں سمجھا گیا تھا؟ اور اگر زندگی میں نہیں سمجھا گیا تو کم از کم موت کے بعد ہی انہیں ایوارڈ دے دیا جائے۔"

اس پر "شیم شیم" کے نعرے لگائے گئے۔ نہ جانے فکر تونسوی کو "شیم شیم" کہا گیا یا ساہتیہ اکیڈمی کو؟ بہر کیف غصے اور جوش کی متفقہ تالیوں کی گونج میں اس تجویز کی تائید کر دی گئی۔

ماتمی میٹنگ کے خاتمے سے چند منٹ پہلے صدر جلسہ اُٹھ کر چلے گئے۔ کیوں کہ انہیں ایک سفارت خانے کی کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ مگر جاتے جاتے وہ ماتمی فنڈ میں ایک سو ایک روپیہ چندہ دینے کا اعلان کر گئے اور باقی ماندہ حضرات نے انسانیت کے بوجھ تلے دب کر جس طرح چندہ ادا کیا اس کے لئے پورے ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ضرورت ہے!

ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا جب سیاہ ساڑھی میں ملبوس میری بیوہ بیوی کو مائیکروفون پر آنسو بہانے کے لئے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی سٹیج پر توڑی، ماتھے کا سیندور اور بندی مٹائی، آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آنسو بھر لائی ــــــ اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے انتہائی دل کش اور دل رُبا لگی۔ بیواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سُتی سُتی، بھیگی بھیگی جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا: "اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بنی تھی؟"

اُس کی مسلسل سسکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر یہ غم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے کہ کم از کم

میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گساری سے محفل پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ تک نہیں نکلتا تھا، نہ آہ کا، نہ واہ کا، چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سکریٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا ـــــ اور "فکر تونسوی میموریل کمیٹی" کے پانچ معزّز ممبران میری بیوہ کی دل جوئی کے لئے قریبی ریسٹوراں میں چلے گئے۔ یہ ریسٹوراں کافی اور آملیٹ کے لئے بہت مشہور تھا۔ کاش! میں ان سے اتنا کہہ سکتا: "حضرات میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آملیٹ اس بدنصیب کو بھی مل جائے"!

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا۔ میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا ـــــ بیٹھا رہا ـــــ بیٹھا رہا ـــــ نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا، نہ جانے کتنی صدیاں، کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجوڑا اور ایک کرخت سی آواز آئی: "صاحب اٹھیئے، میٹنگ ختم ہو گئی"!

اور میری صدیوں کی نیند کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چپڑاسی کھڑا تھا اور میں نے ہڑبڑا کر پوچھا "میں کہاں ہوں"؟

چپڑاسی ہنس دیا: "فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھائل نامراد آبادی کے ماتمی جلسے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کب کا ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟"
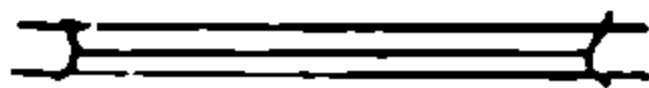
میرا پُنر جنم

اور پھر ایک دن یُوں ہوا کہ میرا پُنر جنم ہوگیا!

گردوپیش نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ میری بیوی نے میرے ساتھ پُنر جنم نہیں لیا۔ کیوں کہ وہ مجھ سے بور ہو چکی تھی اور کہا کرتی تھی کہ اب وہ کسی جنم میں بھی میرا ساتھ نہیں دے گی۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ بیویوں کے ساتھ صرف ایک جنم کی رفاقت ہی کافی ہوتی ہے۔ بیوی ایک لطیفہ ہے جو ایک بار سننے سے ہی باسی ہو جاتا ہے۔

درحقیقت مَیں دوبارہ جنم نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ میرا عقیدہ یہ تھا کہ آتما ایک مُرغے کی مانند ہے جو ہر جنم میں کُکڑوں کُوں ہی کرتا ہے۔ اس کے صوتی اثرات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی اس لئے صدقِ دل سے میری یہ خواہش تھی کہ میری آتما یا تو روحِ عظیم یعنی بھگوان میں ضم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجھے انسان کی بجائے اُلو بنا دیا جائے کیوں کہ اُلو احساس سے

عادی ہوتا ہے اور احساس ہی پچھلے جنم میں میری سب سے بڑی اذیت تھا۔
لیکن میرے خیالات، بھگوان کے خیالوں سے لگا نہ کھا سکے اور بھگوان نے اپنے اختیاراتِ خصوصی کا استعمال کرتے ہوئے مجھے پھر انسان کے گھر پیدا کر دیا۔ آہ! انسان کو اُلّو بننا بھی نصیب نہیں!

جس گھر میں مجھے دوبارہ پیدا کیا گیا۔ وہ میرے سابقہ گھر سے صرف آٹھ گز کے فاصلے پر تھا یعنی صرف دو مکان چھوڑ کر تیسرے مکان میں مجھے پیدا کر دیا گیا۔ خالقِ دو جہاں کی کائنات اتنی وسیع و عریض تھی کہ وہ اگر مجھے کسی اور جگہ پیدا کر دیتا تو ذرا اورائٹی پیدا ہو جاتی اور اگر میں اتنا ہی گیا گذرا تھا تو مجھے کانگو میں پیدا کر دیتا، جزیرہ سماٹرا میں پیدا کر دیتا۔ لندن بھی کوئی بُرا نہیں تھا۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ جس گلی کے ایک سرے سے میری لاش نکلی، اسی گلی کے دوسرے سرے سے میری روح پھر داخل ہو گئی۔ تعجب یہ ہے کہ میری آتمانے دو جنموں کے درمیان صرف دو مکانوں کا فاصلہ طے کیا۔ بعض آتمائیں کتنی سست رفتار اور کاہل ہوتی ہیں اور وہ بھی راکٹ کے زمانے میں؟

میرے سابقہ والد صاحب کا نام کشن داس تھا۔ موجودہ والد صاحب کا نام بشن داس تھا۔ دونوں کسی ایک ہی غزل کے قافیے ہوتے تھے۔ دونوں پڑوسی تھے اور پڑوسی ہونے کے باعث رواج کے مطابق ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور پھر ابھی دونوں کا پنر جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں بدستور بقیدِ حیات تھے۔ انسانی رشتوں کی تاریخ میں شاید یہ سب سے پہلا واقعہ تھا کہ ایک بیٹے کے دو باپ تھے۔ دونوں جائز باپ تھے اور دونوں زندہ تھے۔

دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ہوش کی آنکھ کھولی جب میں چھ سال کی عمر کو پہنچا تو مجھے اپنے گرد و پیش کی ہر شئے جانی پہچانی لگی۔ وہی گلی، وہی در و دیوار، وہی گلی کے نکڑ پر چارپائی پر بیٹھا کھانستا ہوا بابا مکندا جو گلی کی مہترانیوں پر یہ کہہ کر دھونس جمایا کرتا تھا کہ میرا بھائی کسی زمانے میں میونسپل کمشنر تھا۔ لہٰذا تمہیں نوکری سے برخاست کرا دوں گا۔ وہی بیرہ رام دلاری، جس کے باقاعدہ ننگے بچے دھول مٹی میں رُلا کرتے تھے اور جنہیں میرے دو جنموں کے وقفے میں بھی تن ڈھکنے کا لباس مہیا نہیں ہوا تھا اور وہی میرا چھوٹا بھائی کالو جو آوارہ تھا اور سینما کی ٹکٹیں بلیک میں بیچا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ "بھگوان ہر ایک کو روزی دیتا ہے خواہ کسی طریقے سے دے"!

ہوش سنبھالنے کے دو چار مہینے تک تو میں حیرت زدہ رہا اور "خاموشی معنی دارد . . ." پر عمل کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ پچھلے جنم کی بہت سی باتیں میرے ذہن کے سمندر پر لاشوں کی طرح تیر تیر کر اُوپر اُبھرنے لگیں اور میرے اعصاب میں ایک کلبلاہٹ سی پیدا ہو گئی۔ اور ایک دن جیسے میں بے اختیار ہو کر پھٹ پڑا اور اپنے والد بشن داس سے عرض کیا۔ "قبلہ! گستاخی معاف! آپ میرے والد نہیں ہیں"!

والد صاحب قبلہ مسکرا دیئے جیسے ہر باپ اپنے بچے کی معصوم شرارت پر خوش ہو جاتا ہے اور بلند آواز سے بولے۔ "میں نے کہا بیگم! سنا تم نے ــــ؟ صاحبزادے کیا فرماتے ہیں؟ ہی ہی ہی!"

میں نے مکرر عرض کی "مگر وہ بھی میری والدہ نہیں ہیں"!

اس پر والد صاحب قبلہ سنجیدہ ہو گئے اور ایک سا تھپڑ ارشاد کرتے

ہوئے بولے:

"اے ناہنجار تم کون ہو؟"

"میں فکر تونسوی ہوں"

"فکر تونسوی؟" والد صاحب کو نام کچھ آشنا سا معلوم ہوا۔ شاید وہ تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے ہوں گے۔ بڑے تیقّن سے بولے: "مگر وہ تو انتقال کر چکا ہے"۔

میں نے تصریحاً کہا ۔ "بجا فرمایا۔ لیکن فکر تونسوی کا مستقل انتقال نہیں ہوا۔ دراصل اسے کسی نے قتل کر دیا تھا اور ......"

"میں جانتا ہوں"۔

"اور اس کے بعد ......"

"اور اس کے بعد تم سیدھے ہمارے گھر آ گئے"۔ انھوں نے شاید دل ہی دل میں کہا اور پھر اس ڈر سے کہ کہیں یہ واقعی فکر تونسوی نہ ہو۔ میرا امتحان لینے کی خاطر پوچھنے لگے۔

"اچھا بتاؤ، تمہارے والد کا کیا نام تھا؟"

"کشن داس"

"کیا کام کرتا تھا؟"

"ہلدی میں ملاوٹ کرتا تھا"۔

والد صاحب کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ یہ جوابات تو سو فی صد صحیح تھے۔ مزید زرد ہونے کے لئے انھوں نے کچھ مزید سوالات پوچھے۔ جن کے جواب میں نے سو فی صد صحیح دئے۔ مثلاً یہ کہ رام دھن بزاز کی بیوی برہم کماریوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور علاقہ کے سکول کے پرنسپل

جگن ناتھ اور مندر کا پجاری شو شمبھو پرشاد ایک بھگتنی کو بھگوان کے براہِ راست درشن کرانے کے لئے اغوا کر کے لے گئے تھے وغیرہ وغیرہ وغیرہ .....

ان انکشافات نے میرے والد صاحب کی حالت دگرگوں کر دی اور جب انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتایا کہ ہمارے گھر میں جس بیٹے نے جنم لیا تھا وہ پچھلے جنم میں شاعر اور ادیب تھا تو والدہ صاحبہ نے سر پیٹ لیا کہ ہائے بھگوان! ہم نے کون سے بُرے کام کیے تھے کہ ہمارے گھر شاعر پیدا ہو گیا ہے مگر میں نے والدہ محترمہ کو تسلی دی کہ اس مرتبہ شاعر نہیں بنوں گا بلکہ ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کروں گا۔ تو وہ روتے ہوئے بولی —— "تمہارا کیا اعتبار ہے بیٹا! تمہارا صرف قالب بدلا ہے آتما تو وہی ہے اور آتما اپنی خاصیت تھوڑے بدل دیتی ہے۔"

آہستہ آہستہ سارے محلّے اور شہر میں غوغا مچ گیا کہ کشن داس کمیشن ایجنٹ کے گھر جس بچے درشن کمار نے جنم لیا ہے وہ دراصل فکر تونسوی ہے۔ مرتے ہوتے یہ خبر میرے سابقہ والد صاحب کشن داس جی تک بھی پہنچی تو انہیں بے حد رنج ہوا اور سنالجے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ "دھتکار ہے ایسے بیٹے پر۔ ارے! جب تو جانتا تھا کہ کشن داس سے ہماری دیرینہ ناچاقی ہے تو اس کے گھر کیوں پیدا ہوا تو انتہائی ناخلف نکلا۔ کئی بیٹے زندگی میں نہیں، مرنے کے بعد ناخلف نکلتے ہیں۔"

قبلہ والد صاحب (سابقہ) کے اس اندازِ فکر پر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اور پھر معلوم ہوا کہ وہ آواگون کی تھیوری کے ہی مخالف ہو گئے ہیں اور دنیا بھر سے کہتے پھرتے ہیں کہ وہ میرا بیٹا ہے ہی نہیں اور یہ پُنر جنم کا فلسفہ سراسر ڈھونگ ہے ...... آہ! انسان کس طرح اپنی ایک چھوٹی سی حقیر خود غرضی

کی خاطر بڑے بڑے فلسفوں کو حقیر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ حالانکہ مجھے بخوبی یاد تھا
کہ والد صاحب آواگون کے فلسفے کے پُرجوش حمایتی تھے اور فرماتے تھے کہ فکر
بیٹا! تمہاری والدہ پچھلے جنم میں ایک بھینس تھی۔ ایک بار میں نے اس بھینس
کو ایک ڈنڈا رسید کیا تھا تو اس نے دھمکی دی تھی کہ میں اس کا انتقام لوں گی۔
چنانچہ فکر بیٹا! اب وہ میری بیوی بن کر مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔

میرے پُنرجنم پر شائقین جوق در جوق میری زیارت کو آنے لگے۔ ان شائقین
میں میری محبوبہ بھی شامل تھی جو مجھے چوری چھپے دیکھنے آئی۔ پہلے تو میرے ہجر پر روتی
تھی۔ اب میرے وصال پر روئی۔ کیوں کہ اب مجھ پر عشق کی بجائے بچپنا سوار تھا۔
اور میرے والد صاحب (سابقہ) قبلہ کی نظر بچا کر چوری چھپے اپنی بیوی کو دیکھ آیا۔
اور بیوی کی بیوگی کو دیکھ کر چوری چھپے روتا رہا۔ یہ ایک عجیب دردناک صورت
حالات تھی کہ ایک عورت کا خاوند موجود تھا اور سماج اسے بیوہ کہے جا رہا
تھا ——

شہر کے اخباروں نے ایک جدت یہ کی کہ میرے پچھلے جنم اور موجودہ جنم
کے فوٹو ساتھ ساتھ شائع کر دیئے اور اس طرح اپنے گاہکوں کو احمقانہ مسرت عطا
کی۔ دوسری طرف آواگون کے مداحوں اور مخالفوں کے درمیان "سول وار" کی خبریں
آنے لگیں اور ایک اطلاع کے مطابق ان دنگوں میں بہت سے آدمی زخمی ہو گئے۔
(جن میں سے ایک کی حالت نازک بیان کی جاتی ہے)۔ میرے احباب (پچھلے جنم
کے) دوبارہ میری ماتم پُرسی کو آئے اور مجھے چھ سال کا بے ڈول سا بچہ دیکھ کر کہنے
لگے۔ "فکر تونسوی! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے پُنرجنم ہو گیا ہے، خدا تم سب کو پُنرجنم عطا کرے"۔
جان پہچان کے مختلف لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ محلّے کی بڑھیا رام دئی برہمنی

آئی اور مجھے دیوتا سمجھ کر میرے چرن چھوتے ہوئے بولی :

"بیٹا! تم بھگوان سے ہو کر آئے ہو — تم نے میرے بیٹے دولت رام گھائل کو تو نہیں دیکھا؟"

میں جھٹ پہچان گیا۔ دولت رام گھائل جس کے نصیب میں دولت کم اور گھاؤ زیادہ لکھے تھے۔ رام دئی برہمنی کا بیٹا تھا۔ وہ شاعر تھا اور شاعر ہونے کی وجہ سے حسبِ رواج مفلس از قلاش تھا اور گھٹیا اور سستی اور زہریلی شراب پیتے پیتے جان بحق ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "نہیں ماں جی! گھائل صاحب تو ادھر کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ میرا خیال ہے کہیں پُنر جنم لے چکے ہوں گے"۔

"لیکن کہاں ؟ اس کی تو کچھ سُدھ خبر ہی نہیں بیٹا!"

"اب میں کیا جانوں ماں جی! ممکن ہے میری طرح اس محلّے میں ہی جنم لے چکا ہو"۔

رام دئی برہمنی مضطرب ہو گئی۔ بولی: "تمہارے منہ میں گھی شکر بیٹا! کتنا اچھا ہوتا اگر وہ پھر میرے ہی گھر میں جنم لے لیتا"۔

میں نے متفکروں کی طرح جواب دیا۔ "جنم تو کرموں کی بنا پر ملتا ہے ماں جی!"

"کرم تو اس کے اتنے اچھے تھے بیٹا کہ وزیر بن سکتا تھا"۔

"ویری سوری! پھر تو وہ جہنم میں گیا ہوگا"۔

رام دئی مجھے گالیاں دیتی ہوئی چلی گئی۔

والدہ محترمہ (موجودہ) سچ کہتی تھی۔ میرا چولا بدلا تھا۔ روح وہی تھی۔ میں پُنر جنم کے بعد بھی وہی "فکرِ تونسوی تھا"۔ وہی احمقانہ کھرا پن۔ وہی بے اثر

طعنے مہنے ۔ اور میں نے محسوس کیا کہ لوگ اب میری باتیں سن کر خوش کم ہوتے ہیں اور ناراض زیادہ۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے ہمارے گھر آنا جانا کم کر دیا بلکہ بند کر دیا۔ محلے کے معززین نے اپنے بچوں کو ہدایت کر دی کہ میرے ساتھ کھیلنا کودنا بند کر دیں ۔ عورتوں نے میری ماں سے اور مردوں نے میرے باپ سے بات چیت بند کر دی اور اب میرے والدین مجھے سانپ کا بچہ سمجھ کر پال رہے تھے میری بھوک میری بھوک نہ رہی بلکہ کتے کی دھتکار بن گئی ۔ میرے کپڑے میری چمڑی ادھیڑنے کا باعث بن گئے ۔ میرے کھلونے میری انگلیاں مروڑنے لگے (کھلونے والدین کا حکم مانتے تھے میرا نہیں) ۔

اس بیک وقت متوقع اور غیر متوقع صورتِ حالات نے مجھے بے حد اداس کر دیا اور میں اکثر رات کی کالی گہری تاریکیوں میں تکیے بھگو بھگو کر رو یا کرتا ۔ اور بھگوان سے "گڑگڑا کر" دعا کیا کرتا کہ اے خالق! میری یادداشت مجھ سے چھین لے، میرے حافظے کو مسخ کر دے ۔ سابقہ جنم کی ہر نعمت مجھ سے واپس لے لے ۔

لیکن بھگوان کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ میرے لئے جینا دوبھر ہوتا گیا ۔ میرا تازہ تازہ معصوم دل محبت کا بھوکا تھا لیکن میری بھوک نفرت سے مٹائی جاتی بھگوان نے مجھے نیا جسم ضرور عطا کیا تھا، نئی عقل عطا نہیں کی تھی ۔ اس لئے میں دنیا کے سامنے یہ جھوٹ بھی نہیں بول سکا کہ میں نکر تلسوی نہیں ہوں بلکہ ایک گیدڑ ہوں، گدھا ہوں، چیونٹی ہوں اور میں تم میں سے کسی کو نہیں جانتا نہ بلشن داس کو، نہ کشن داس کو، نہ رام دتی کو، نہ پرنسپل کو ۔

اور اسی لئے دنیا اب مجھ سے (خواہ مخواہ) خوف کھانے لگی ۔ میرے سائے

سے گریزاں رہنے لگی، کوئی میرے قریب تک نہیں پھٹکتا تھا۔ میں چھ سال کا ایک معصوم سا بے گناہ بچہ، اتنی بڑی، بوڑھی دنیا سے الگ ہوگیا، تنہا ہوگیا اور اپنی زندگی صرف اپنے ساتھ ہی گذارنے لگا اور یہی مواقع خودکشی کے لئے موزوں سمجھے گئے ہیں۔

لیکن ایک دن اچانک تنہائی کا یہ ہالہ ٹوٹ گیا۔

دراصل اخبار میں کسی نے شکایت کردی کہ جس شخص نے فکر تونسوی کو قتل کیا تھا اور چھ سال تک تلاش نہیں کیا جا سکا تھا۔ اب اس کا سراغ لگایا جائے اور فکر تونسوی سے پوچھا جائے کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ کیوں کہ وہ پچھلے جنم کے انکشافات سونی صد سچ بتا رہا ہے! کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے قاتل کے بارے میں لاعلم ہو۔

اس شکایت پر شہر بھر میں میرا مردہ زندہ ہوگیا۔ چاروں طرف سے نئی تفتیش کے مطالبے ہونے لگے۔ ایک مشتعل ہجوم نے تو اس سلسلے میں ایک پولیس اسٹیشن کو آگ بھی لگادی۔ چنانچہ حکام خوف زدہ ہوگئے اور ایک پولیس افسر تحقیقات کے لئے میرے پاس آپہنچا اور بولا۔ "فکر صاحب.....!"

"فکر تونسوی مرچکا ہے"۔ میں نے کہا۔

"ہائے اس کی موت ہی تو ہماری مصیبت کا باعث بنی ہے۔ برادرم آپ ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیے اور بتائیے کہ آپ کو کس شخص نے قتل کیا تھا؟"

"ایک اسکوٹر ڈرائیور نے"۔

"قتل کی وجہ تسمیہ کیا تھی؟"

"نہایت معمولی۔ اس نے مقرّر نرخ سے چار آنے زیادہ کرایہ طلب کیا۔ میں

نے اسے شرم دلائی ۔ اُسے طیش آگیا اور چھُرا نکال کر اس نے میرے پیٹ میں بھونک دیا۔

"صرف چار آنے کی خاطر اتنے بڑے فن کار کو قتل کر دیا ؟"

"جی ہاں، کیوں کہ ان دنوں چار آنے میں ایک سنگترہ آجاتا تھا۔ جب کہ فن کار ایک ایک آنے میں مل جاتے تھے"۔

پولیس افسر کو طیش آگیا اور بولا ۔ "ہم اسے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ آپ اس کا حلیہ بتایئے۔ اسکوٹر کا نمبر بتلایئے !"

مجھے اس کا حُلیہ اور سکوٹر نمبر اب بھی پوری طرح یاد تھا۔ لیکن .... لیکن ...... کیا یہ اُسے پھانسی دے دیں گے ؟ میرا ننھّا سا معصوم جسم سر سے پاؤں تک لرز اُٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے پھانسی کا پھندا اسکوٹر ڈرائیور کی بجائے آہستہ آہستہ میری گردن کی طرف بڑھ رہا ہے .... میں اس کا حلیہ نہیں بتاؤں گا ورنہ اسے مار دینگے۔ نہیں نہیں ! میں نہیں ..... مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے اور ..... میں سچ مچ بھاگ کھڑا ہوا۔ زور زور سے بھاگتا گیا ۔ گلیاں، سڑک، بازار، اور پھر میں تعاقب کرنے والوں کی آنکھ بچا کر ایک موڑ مڑ گیا اور ایک تنگ و تاریک گلی میں گھُس گیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے اس تاریکی میں ایک چہرہ ابھرا ہے ۔ یہ چہرہ بھیانک تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکدار چھُرا تھا .... میں نے اسے پہچان لیا ۔ یہ وہی تھا، بالکل وہی، وہی سکوٹر ڈرائیور ۔ بالکل وہی سکوٹر ڈرائیور .....

اور اس نے چھُرا مار کر مجھے ایک بار پھر قتل کر دیا ۔
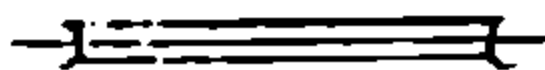
بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اکلوتی اور پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ بلّہ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولی۔ "جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ بتاں تھا، آج کسی انجمن خدامِ وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا ؎

"اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار، ہلا دو

میں نے کچھ مسکرا کر (اور کچھ ڈر کر) کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھانا

سے آؤ۔"

وہ اپنی سڈول بانہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی "آج کھانا نہیں پکے گا، آج چولھا ڈاؤن اسٹرائیک پہ ہے۔"
شب یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔
معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا "بیگم! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم میری بیوی ہو۔"
تڑاخ سے جواب آیا "مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں۔"
"مگر ڈارلنگ!" میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا "مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اِس گھر کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو، بتاؤ ہو کہ نہیں؟"
ایک دن پہلے تک مینوا یہی فقرہ طلسم ہوش رُبا کا کام کر جاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آ گرتی تھی لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ـــ
"سیٹھ جی! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکّی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور ....
"جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔"
میں نے کہا۔ "کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟"

وہ بولی :۔ "نہیں شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا آج جاگ اُٹھا ہے۔
لہٰذا میرے مطالبات مانئے نہیں تو ......"

"کون سے مطالبات؟"

"سب سے پہلے بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز
میں گھنگھروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی۔
سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں۔
صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ
کام کرتی ہوں، انہیں کم کر کے نو گھنٹے کئے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی
دستور ہے۔"

"مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے!"

وہ بھڑک اٹھی :۔ "اور بائی دی وے، جب تک مطالبات کی گفتگو
جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔۔۔۔ ہاں تو
ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور
ہیں؟"

میں نے کہا :۔ "دیکھو (ڈارلنگ نہیں) ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے
کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ
کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں
اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں؟"

سوکن کا جلاپا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ
کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے مگر بیگم کے اندر
جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی :۔ "یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے۔

آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکن دانے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔" مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے تمہارے گورے گورے ہاتھوں پر لاکر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اُسے خود سوچنا چاہیئے۔"

"آل نرائٹ"۔ میں نے تنگ آکر کہا۔" مینجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گا۔ اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

"مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

" دیکھئے آپ اسے مذاق میں مت ٹال دیئے (حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یونہی گھومتے گھامتے چائے پینے آٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقرعید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا لیکن مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (خدا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینجمنٹ کا رویّہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اُسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔"دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی، سماج میں ایک تعطل آ جائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہو جائے گی۔ سارا کام اُس روز چوپٹ ہو جائے گا۔ یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرا دی گئی ہے۔ بچے روئینگے میں روؤں گا۔ گھر کی بلّی اور طوطا اور چوہا سبھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں تمہاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟"

"آپ کیجئے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا۔" اچھا چلو میں تمہاری ہفتے وار چھٹی منظور کرتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کرو گی کیا؟"

"مَیں بیٹھی رہوں گی، لیٹی رہوں گی، تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے، اوریجنل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں، یعنی چھٹی کے دن کام کرو تو دوگنی اُجرت

ملے گی" اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا۔ لیکن بیوی کو اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی " ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے ۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو"۔

میکے کے 'پنچ' پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات ذرا نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی پخ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیرِ لب تبسم سے اس فیصلے پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اُسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں رہے ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہو گئی ہے مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز

تھا۔ میں نے جھٹ کہا۔ "بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے بلکہ صرف ہمدردی ہے"۔

وہ تڑپ اٹھی۔ "مگر صرف ہمدردی سے تو بنیائن بھی نہیں آسکتی"۔

"تو بنیائن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی"۔

تو اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں"۔

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیارِ زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس لیے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کئے اور دھمکی دی "یہ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو۔ خالی خولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی"۔

"تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ! جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھاؤ"۔ انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

"رشوت لو، جیب کتری شروع کردو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائیسنس لے لو۔ ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے"۔

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے میں اسے چند کرسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیائنوں اور آلوؤں کی خاطر تباہ و برباد

نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مُصر تھی "ہر دَور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہر پن کو مشکوک قرار دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔۔ یہ رویّہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا مگر میں نے بھی تہیّہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا، خاندانی اخلاق کو طلاق نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بحرانی خاموشی کے بعد بیگم بولی "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ ردّ کیا جاتا ہے"۔ میں نے تاریخِ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس بات پر غور کروں گی کہ پچھلے دو مطالبے بھی منظور کراؤں یا نہ کراؤں؟"

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے مطابق بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر لیں لگا کہ جیسے ہم دونوں

ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر رونے روتے سو گئے تھے۔ کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آ گرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر نہیں تھا؟

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی جو کہہ رہی تھی:

"اٹھو کھانا کھا لو ——— مجھے نیند نہیں آ رہی ہے!"
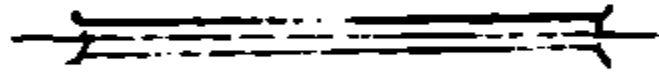
محلّہ سُدھار کمیٹی

بھائیو، بہنو! تھوڑی سی داد اور بہت سے بچّو!

آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلّہ سُدھار کمیٹی کی اس سالانہ میٹنگ کا صدر بنا دیا۔ میں صدارت سے ہمیشہ بدکتا ہُوں کیونکہ یہ ایک ایسی عزّت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے اور اس سے راست گفتاری چھین لیتی ہے مثلاً اب میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر مَیں بیٹھا ہوں اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹنے کے قریب ہے اور میں پُورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالے رہا ہوں۔

حضرات! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلّہ ایک کرسی ہے جس کی ایک ٹانگ ہمیشہ ٹوٹنے کے قریب رہتی ہے اور ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالے پر ہمارا کافی وقت صرف

ہوتا ہے ۔ میرا خیال ہے وقت کا یہ انتہائی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلّہ سے چونکہ بے حد محبّت ہے ۔ اس لئے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے ——— جناب والا! محبت' انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے ۔ یہ تو ہماری ذہانت ہے کہ ہم نے اس بدنصیبی کو قربانی کا دلفریب نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے ورنہ خدا نے تو ہمیں جذبۂ محبت عطا کر کے ہمارے ساتھ کافی بڑا دھوکا کیا تھا ۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صاحبان بلکہ "صاحبات" تک کی تقریریں سُنیں جو محلّہ سُدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں ۔ ان تقریروں سے ہی مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلّہ بگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے ۔ اس لئے ہمارا سدھار ہونا چاہیئے ۔ آہ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کریں ۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادری ہے اور ہم بہادر لوگ ہیں ۔ صاحبان! اگر ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیحت کریں کہ آپ کے کپڑے میلے ہیں' انھیں دھو یا کیجئے' حالانکہ پیغمبر اگر کپڑے نہیں دھوتا تو اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہوگی ۔ جو اسے خود اچھی طرح معلوم ہوگی ۔

اس لئے جناب! میری مانیے تو اس محلّہ کا سُدھار مت کیجئے ۔ اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دھو لیجئے ۔ صرف صابن کے پراپگینڈہ کی خاطر اتنے زیادہ لوگوں کو ایک میٹنگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے!

——— چند دن ہوئے اس محلّہ کے ایک بزرگ آ بدیدہ ہو کر کہنے لگے ۔ نکڑ صاحب! اس محلّہ میں چوہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے مگر کوئی ان کا

تدارک کرنے والا نہیں ہے۔" میرا خیال ہے وہ چوہوں کی سینہ زوری پر آبدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں گرد پڑ گئی تھی۔ ورنہ چوہے تو چوہے دان کے ذریعے بڑی آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم چوہے دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب! ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان نہ بنائے بلکہ چوہے بنا دے۔ جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنہیں صابن کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ چوہوں نے کبھی چوہا سدھار کمیٹی بنائی ہو۔ اور گردوں کی آڑ میں آنسو بہائے ہوں بھائیو اور بہنو! برا نہ مانیے تو میں کہوں گا کہ چوہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گزار رہے ہیں۔

آپ شاید مجھ پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلہ سدھار نہیں چاہتا۔ ایسا ہی شبہ مجھ پر اس محلہ میں کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو! کہ دنیا کے ہر محلہ میں محلہ سدھار کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ اور ہر محلہ میں سدھار کا مسئلہ پایا جاتا ہے لیکن اس کی ایک معقول وجہ ہے کہ دنیا کے ہر محلہ میں رات کو بے تحاشا کتے بھونکتے ہیں جس سے اہلِ محلہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلہ میں ایک نہ ایک جھگڑالو عورت رہتی ہے جو خللِ امن کا باعث بنی رہتی ہے۔ ہر محلہ میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلہ کا اخلاق ہمیشہ تلوار کی دھار پر رہتا ہے اور ہر محلہ میں پانچ دس ریٹائرڈ بوڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سرہانے جلا کر بیٹھے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب خداداد نعمتیں ہیں ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ ان سے کوئی بھی محلہ نہیں بچ سکتا۔ اگر کسی محلہ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے

تو وہ محلہ نہیں رہتا بلکہ جنت بن جاتا ہے اور معاف کیجئے، جنت ایک انتہائی اُکتا دینے والی چیز ہے، جنت، شوکیس میں ایستادہ "پلاسٹک" کی ایک حسینہ ہے جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر ان پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس بوسے میں نہ حلاوت ہوتی ہے نہ حرارت ——— سچ بتائیے کیا آپ پلاسٹک کی اس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اس جہنم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ یہ پلاسٹک کی جنت میں حرارت اور حلاوت پیدا کرتی ہے۔ میں تو جب محلہ کی کسی جھگڑالو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جنت کے ساتھ جہنم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلّہ کو پلاسٹک کی حسینہ بننے سے بچالیا۔ جناب والا! خدا پر اعتبار کیجئے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دُور اندیش ہے جس نے ہمیں زندگی کی حلاوت اور لذت بخشنے کے لئے انگور ہی عطا نہیں کئے بلکہ ریٹائرڈ بوڑھے بھی عطا کر دیئے جو لومڑی کا رول ادا کرتے ہیں۔

آج کی میٹنگ میں ایک معزز مقرر نے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دُھت ہو کر آتا ہے اور دُھوم دھڑم مچاتا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ اسے محلہ سے باہر نکال دیا جائے ——— صاحبان! میری رائے ہے کہ اُسے محلہ سے مت نکالیے ورنہ وہ کسی دوسرے محلہ میں چلا جائے گا جہاں پھر اُدھم مچائے گا اور پھر نکال دیا جائے گا کیونکہ ہر محلہ میں محلہ سدھار کمیٹی موجود ہے ———

لہٰذا میں اُس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ شاعری ترک کر دے اور کہیں لوئر ڈویژن کلرک بن جائے۔ شاعری ترک کرنے ہی سے وہ میگساری ترک کر دے گا کیونکہ لوئر ڈویژن کلرک کے اندر ہلدی، نمک اور ایندھن خریدنے کی

تمنا بیدار ہو جاتی ہے اور شراب خریدنے کی جرأت اور استطاعت مر جاتی ہے۔ شراب ہی لطیف اور نفیس احساسات کو جگاتی ہے مگر ہلدی اور نمک لطیف احساسات کو سُلا دیتے ہیں۔ بلکہ مار دیتے ہیں۔ اس لئے اگر ہمیں اس شاعر کا سدھار کرنا ہے تو اس کے اندر بسے ہوئے شاعر کو مار دینا چاہیئے۔ ہمارے محلّہ کو شاعری کی ضرورت نہیں، ہلدی اور نمک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہلدی اور نمک کبھی اُدھم نہیں مچاتے۔ حضرات! اگر آپ سب لوگ شاعر نہیں بن سکتے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ آپ کے لطیف احساسات ایندھن کے ڈھیر کے نیچے دب گئے ہیں، سو گئے ہیں، مر گئے ہیں۔

ہاں! میں اُس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ مر جائے اس کی لاش کو کندھا دینے کے لئے پوری محلہ سدھار کمیٹی موجود ہے ــــــــــ

چند دن ہوئے، محلّہ میں کیرتن کرانے کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا میں نہیں جانتا کہ اس کیرتن سے محلّہ میں کتنے فی صدی رُوحانی جذبات پیدا ہوئے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کیرتن کے بعد پولیس آئی اور ہمارے محلّہ کے لالہ کانشی رام جی کو لوہے کی بلیک کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی۔ حالانکہ لالہ جی نے کیرتن کے لئے سب سے زیادہ چندہ دیا تھا اور کیرتن کے بعد اپنے ہاتھ سے مقدّس پرشاد بانٹا تھا (کیا یہ افواہ سچ ہے کہ اس نے اپنے بچوں کو نسبتاً زیادہ پرشاد دیا تھا؟) بہرکیف مجھے پولیس کا یہ فعل پسند نہیں آیا۔ کیونکہ اس نے کیرتن کے رُوحانی اثرات پیدا ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ در اصل لالہ کانشی رام سے زیادہ ہمیں پولیس میں رُوحانی اثرات پیدا کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کیرتن کے تقدّس کو اس طرح

ہتھکڑیاں پہنائی جاتی رہیں گی۔

میں نے جب جیل میں لالہ کانشی رام سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکلا تو انھوں نے فلاسفروں کی طرح جواب دیا: "لوہے کی بلیک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کیرتن کے جماعتی نتیجے سے کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھ لینا مجھے کیرتن کا پھل الگ ملے گا اور میں چھوٹ جاؤنگا۔"

"کیسے؟" میں نے تشریحاً پوچھا

وہ مسکرائے اور بولے: "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہوکر پولیس کی بدھی بھرشٹ کردی ہے اور میرے ساتھ رشوت کی بات چیت چلا رہی ہے۔ کیرتن کا پھل رائیگاں نہیں جاتا فکر صاحب! آپ کی عبادت میں سچی عقیدت اور خلوص ہونا چاہیئے۔ میں پوچھتا ہوں، ذرا بتایئے، پولیس کی بدھی بھرشٹ کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟"

بھائیو اور بہنو! لالہ کانشی رام کی یہ تشریح اگرچہ الجھی اور ناقابلِ فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہوگئے تو کیا ہم میں سے کسی کی جرأت ہے کہ کیرتن کے روحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شبہ میرے دل میں ابھی تک رینگ رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلے کے بھگوان داس چپراسی کا سامان جب اس کے مالک شری نارائن داس نے باہر پھینک دیا تھا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چپراسی کو کیوں نہیں ملا ـــــ حالانکہ کیرتن میں اس نے سب سے زیادہ سرمستی اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھول بجایا تھا۔ اور رات بھر جاگتا اور گاتا رہا تھا ـــــ کیا کوئی ایسا اہتمام نہیں ہوسکتا کہ خدا بھی اپنی بدھی بھرشٹ کرلے۔ یہ محلہ سدھار کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ رشوت کا بندوبست کرے اور بھگوان داس چپراسی کو دوبارہ مکان دلادے ورنہ خطرہ

ہے کہ محلّہ میں کیرتن کی روایت مشکوک شکل اختیار کر جائے گی اور کیرتن کے روحانی اثرات میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ کم از کم عبادت کی سطح پر تو چپڑاسی اور آنرن مرچنٹ میں فرق مٹ جانا چاہیئے۔ ورنہ ہمارے محلّہ کے لوگ کیرتن کے لئے چندہ دینے سے ہچکچانا شروع کر دیں گے۔ ذرا سوچئے اگر چندہ جمع کرنے میں رُکاوٹ پیدا ہو گئی تو کیا کیرتن منڈلی والے کم اُجرت پر کیرتن کرنے سے انکار نہیں کر دیں گے ؟

محلّے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز ودملانے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلّے کے بچوں میں گندی گالیاں دینے کی قبیح عادت ختم نہ کی گئی تو میں محلّہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ حضرات! مجھے شک ہے کہ وہ محلّہ نہیں چھوڑینگی کیونکہ ان میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور محلّہ کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں۔ اگر محلّہ کے تمام بچے آج فیصلہ کر لیں کہ وہ گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز ودملا کے لئے یہ انتہائی رنجیدہ فیصلہ ہوگا۔ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بُری چیزیں ختم ہو جائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں، اور بُرائیاں ہی مسز ودملا کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ ان کا خاتمہ مسز ودملا کا خاتمہ ہوگا۔ ایک تیر انداز سے اگر کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو وہ اسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اسے آپ پر غصّہ آئے گا اور ممکن ہے، غصّہ میں محلّہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز ودملا ابھی تک محلّہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لئے کیونکہ یہاں کے بچے برابر گندی گالیاں دیئے جا رہے ہیں اور مسز ودملا ان کی ماؤں کو برابر پھوہڑ، بدتمیز اور بدنصیب کہے جا رہی ہیں۔ جناب عالی! اگر ایک تعلیم یافتہ عورت ایک غیر تعلیم یافتہ عورت کو پھوہڑ کہے تو غیر تعلیم یافتہ عورت میں احساسِ کمتری جاگ اٹھتا ہے اور جب لوگوں

میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہو جاتا ہے جو اس احساسِ کمتری کی ستار پر اپنا نغمہ الاپتا ہے۔

اس لئے حضرات! مسز وملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھیے۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محلّہ کی عورتیں پھوہڑ اور بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سن سن کر ہمارے محلّہ کی عورتیں مست ہو رہی ہیں ——— یہ صحیح ہے کہ گندی گالی تہذیب کے زوال کی علامت ہے اور مسز وملا یہ بھی نہیں چاہتیں کہ ایسے قیمتی محلّہ کو جہاں تہذیب زوروں پر ہے چھوڑ کر چلی جائیں۔ در اصل مسز وملا اس محلہ کی عورتوں اور بچوں میں تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتی ہیں چاہے اس کے لئے انہیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے لئے بچے گندی گالیاں سیکھ جائیں ——— جناب! لیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے اس لئے مسز وملا کو قربانی کا موقع دیجیے۔ ورنہ ان کی افسردگی اور بڑھ جائے گی اور آنکھوں کے سیاہ حلقے اور گہرے ہو جائیں گے جو محلّہ کی بدتمیزی پر کڑھتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

بھائیو اور بہنو! ——— اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آخری گزارش کرونگا کہ اس محلّہ کے سدھار کے غم کو اتنا گہرا مت بنائیے۔ بلاشبہ آپ اس میں چند سطحی تبدیلیاں لے آئیے مگر کوئی بنیادی تبدیلی کرنے کی مصنوعی کوشش نہ کیجیے۔ بے شک آپ چوہوں کو محلّہ بدر کرنے کے لئے کوئی مشترکہ فنڈ قائم کر لیجیے۔ (فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اس میں غبن کی گنجائش نہ رہے) چوروں کو ڈرانے کے لئے ایک باتنخواہ پہرے دار بھی رکھیے (پہرے دار سو فی صدی جفاکش اور احمق ہو، تاکہ چوروں سے نہ مل جائے)۔ محلّہ میں

اگر کسی کا انتقال ہو جائے، کسی کا جنم ہو جائے، کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بے شک سب مل کر آنسو بہایئے یا قہقہے لگایئے (اور یہ سب کچھ اس لئے کیجئے کہ آپ کے ساتھ بھی یہ سانحہ ہو سکتا ہے) ——— غرض یہ سب کچھ کیجئے۔ ہر سطحی حرکت کیجئے جس کا آپ کے دل سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ جناب! میں یہ تھوڑی سی کڑوی بات اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے اور نہ ہم میں سے کوئی فرد محلہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت دے گا کہ اس کے دل اور روح کی سلطنت پر حملہ کر دے۔ کیا آپ محلہ سدھار کمیٹی کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ آپ کو انڈہ کھانے کا حکم دے جب کہ آپ ٹماٹر کاٹ کر کھا رہے ہوں۔ ایک بار میں نے محلّہ کے ایک شخص سے کہا: "جناب! آپ کے چہرے پر جو داڑھی ہے وہ انتہائی بدنما لگتی ہے۔ آپ روزانہ شیو کیا کیجئے" تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا جو اس نے مجھ سے قرض لئے تھے ——— اسی طرح ایک بار محلّہ کے ایک معزز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مت کھایا کیجئے۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے ——— میں حیران ہوں کہ میرے دانت جھڑنے سے اس آدمی کو کیا دلچسپی ہے؟ کیا صرف اس لئے میں اس کی بات مان لوں کہ میں کبھی کبھار اس سے اخبار پڑھنے کے لئے مانگ لاتا ہوں؟

اس لئے جناب! ہم ایک محلّہ میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں۔ محلہ سدھار کمیٹی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتی ہے تو یہ اس کی سنگدلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے بالکل

"اسی طرح جیسے آپ نے مجھے صدارت کی عزت دے کر مجھے غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا۔ آپ کے ماننے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو کیوں توڑ دیا ہے اور اس کرسی کے ٹوٹنے والے پائے کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کانشی رام کے گھر سے لائی گئی ہے اور جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں ——
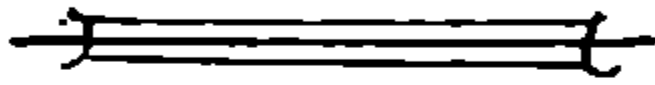
میں بیمار ہوئے

میں بے حد پریشان تھا بلکہ شرمندہ تھا ———
شرمندگی کا باعث میرا نصیب تھا کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی۔ جب بھی کوئی بیماری آتی وہ نزلہ زکام میں بدل جاتی۔ زیادہ سے زیادہ سر کا درد، پیٹ کا درد یا کوئی پھوڑا ابھر آتا اور مجھے جُل دے کر نو دو گیارہ ہو جاتا۔ احباب اور رشتے دار زیرِ ناف قسم کا طعنہ دیا کرتے کہ ان غیر ضروری بیماریوں پر کوئی آپ سے کیا ہمدردی کرے۔ میری بیوی کنکھیوں سے کئی بار اشارے بھی کر چکی تھی کہ میں آپ کی خاطر مٹنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس مرمٹنے کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی تو پیدا کیجیے۔

اور نہ جانے میرے کس پیارے کی دُعا قبول ہوئی کہ ایک دن میں صبح کو شیو کر کے اٹھا تو میری ایک لغزشِ پا نے پکارا، "لینا کہ چلا میں!" میری بیوی

جو شاید اسی نادر لمحے کے انتظار میں ادھیڑ ہو گئی تھی، فوراً ڈاکٹر کو بلا لائی۔
ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ لغزشِ پا ہی نہیں ہے، سیریس بیماری ہے!"
بیوی کی زبان سے بے ساختہ نکلا —— ہائے اللہ! یہ سیریس بیماری ان کی بجائے مجھے لگ جائے!"
ڈاکٹر نے رولنگ دیا۔ "یہ فیصلہ ہسپتال میں جاکر ہوگا کہ بیماری کس جسم کے لئے موزوں ہے، یہ متنازعہ مسئلہ ہے!"

اتنے میں میرے بہت سے احباب اور رشتے دار جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر سے "ولس ہور" کہا اور باری تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ آخر میں تھرڈ ریٹ بیماریوں کے جنگل سے نکل آیا اور اب راہِ راست پر چل پڑا ہوں۔ ان کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو بھر گئے۔ انھوں نے تالیاں بجائیں۔ کئی ایک فرطِ انبساط سے رقص کرنے لگے میری بیوی نے جذبات سے کانپتے لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غسلِ صحت پر یتیموں کو کھانا کھلائے گی۔ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے سرگوشی میں میرے ایک دوست کو بتایا کہ یہ نروس بریک ڈاؤن کی بیماری ہے۔ ہو سکتا ہے، کئی سال لگ جائیں!"
کئی سال —— ؟ مجھے یتیموں کا مستقبل خطرے میں نظر آیا۔

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے بے حد اطمینان ہوا۔ نہ پریشانی باقی رہی تھی نہ شرمندگی ہی۔ بلکہ فخر سے پھولا نہ سماتا تھا کہ اب اس سیریس بیماری کی بدولت میں کئی لوگوں کو اُبلائیج (OBLIGE) کر سکوں گا۔ میرے احباب خلوص اور ہمدردی کا فراخ دلانہ استعمال کر سکیں گے۔ رشتے داروں کو ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو تھرتھرانے کا موقع نصیب ہوگا۔ میری ایک جنبشِ لب پر

وہ اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ میری آنکھ کا ایک ہلکا سا اشارہ ان کی زنگ آلودہ روح کے سبھی بند دروازے کھول دے گا۔ میرے بدن میں ایک چھوٹی سی ٹیس اٹھے گی تو احباب مرغِ بسمل کی طرح ہسپتال کی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میری بیوی ہر پرسان حال کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہہ سکے گی ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غرض میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا! دوسروں کی خوشنودی کے چند لمحے بھی میسر آجائیں تو وہ سُنبل و ریحاں اور لعل دیاقوت وغیرہ سے کم نہیں ہوتے ورنہ اس سے پہلے تو زندگی جیسے بے برگ و گیاہ ریگستان میں گزر رہی تھی۔ نہ کسی کے آنسو، نہ تبسم، نہ جذبات سے چُور چُور ہونٹ، نہ کسی کی ہمدردی، نہ کسی کا خلوص، نہ کسی کا امتحان، نہ کوئی ممتحن ———

ہسپتال میں جاتے ہی سب سے پہلے تو میرے ایک منسٹر دوست نے میرے ریگستان میں ایک پھول کھلا دیا۔ یعنی ایک دوست کے ٹیلیفون پر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ اس مریض کو فوراً ایک بیڈ عطا کیا جائے! ہسپتال میں بیڈ میسر آنے کا مطلب ہوتا ہے جیسے کسی بے روزگار کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے۔ میرے ایک پروفیسر دوست نے میری ہوا باندھتے ہوئے کہا۔ "اجی! بیڈ کیوں نہ ملتا۔ ان کی رسائی تو منسٹروں تک ہے! مجھے منسٹروں کی اس پستی پر رحم کھانا چاہیئے تھا لیکن منسٹر کی خوشی مجھے بیڈ مل جانے میں مضمر تھی۔ اس لئے میں اس پستی کو شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔

بیڈ پل جانے کے بعد میں تین چار دن تک یہ دیکھتا رہا کہ احباب اور رشتے دار نہایت سرگرم ہو گئے ہیں۔ چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی دَوڑ دھوپ کی رپورٹ لے آتے اور میرے حلق میں اُنڈیل دیتے۔ کوئی بتاتا ہسپتال کا ہارٹ اسپیشلسٹ میرے کالج کا ساتھی ہے اور مجھ سے میتھیمیٹکس کی گائیڈ بک لے جایا کرتا تھا۔ کوئی انکشاف کرتا بلڈ بنک کے انچارج سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کی خوش نصیبی ہے آپ کے ہسپتال میں ایک عظیم مریض داخل ہوا ہے۔ یہ انچارج میری خالہ کا چوتھا بیٹا ہے۔ اگرچہ خالہ نے اُسے جائداد سے عاق کر دیا ہے لیکن اس کی کَوریج سے پہلے کے سبھی کَولیٹریں نے ہی قلم بند کر کے دئے تھے۔ ایک دوست نے تین اخباروں میں میری فوٹو اور بیماری کی خبر بے حد ولولہ انگیز انداز میں شائع کروا کے مسرّت حاصل کی جیسے اس نے مجھے مرنے کے بعد جنّت کی سیٹ دلوا دی ہو! چار پانچ دوستوں نے کافی ہاؤس میں ایک ریزولیوشن پاس کروا دیا کہ خدانخواستہ اگر فکر تونسوی کی موت واقع ہو گئی تو پورے کافی ہاؤس کے ممبران نہ صرف باجماعت شمشان بھومی تک جائیں گے بلکہ پسماندگان کے لئے چندہ بھی اکٹھا کریں گے۔

یہ جان توڑ سرگرمیاں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے ورنہ درگور ہو گیا ہوتا! ہر روز کئی ڈاکٹر باری باری آتے اور مجھے لیبارٹری سمجھ کر تجربے شروع کر دیتے۔ جیسے یہ ڈاکٹر نہ ہوں، سکول کے طالب علم ہوں اور میں ایک کاپی ہوں جس پر وہ ہوم ورک کر رہے ہوں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ میرے مرض سے خوش ہونے کی وجہ سے سرگرم ہیں لیکن ایک بار میں نے ان کی خوشی سے بور ہو کر ایک ڈاکٹر سے پوچھا

"جناب! کیا آپ کو مریض سے محبت ہے یا مرض ہے؟"

وہ بولا "مرض سے! کیونکہ ہم مریض پر ریسرچ کر کے مرض تک پہنچتے ہیں۔ آپ پر ریسرچ کرنے سے بنی نوع انسان کو بھی فائدہ پہنچے گا۔"

"اور اگر میں نہ آتا تو بنی نوع انسان کا کیا بنتا؟"

اس کے جواب میں ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا۔ اس مریض کی پی ــــ سی۔ جی بھی کرائی جائے۔ دماغ میں توقع سے زیادہ خلل معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ کے خلل کا سبب میری بے پناہ مسرت ہے، جو مریض بن کر مجھے حاصل ہو رہی ہے میں یہ سوچ کر جھوم اٹھا کہ ہسپتال میں مجھے بے حد رومانٹک ماحول ملے گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کئی آرٹسٹ لوگ ہسپتال میں جا کر ناول تک لکھتے ہیں اور بیماری کو ادبِ عالیہ میں اضافہ کا باعث بناتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک نرسوں سے پیار بھی کرنے لگتے ہیں بلکہ کئی نرسیں تو نوکری پر لات مار دیتی ہیں اور ناول نگار کی رُوح کے نرم گوشے میں دلہن بن کر گھس جاتی ہیں۔

دوسرے دن جب میں جھم سے کسی نرس کی آمد کی انتظار میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ کسی نے میرا کندھا جھنجوڑا۔ یہ واقعی نرس تھی (میرے متوقع ناول کی متوقع ہیروئن)۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ نرس خوبصورت نہ تھی، خوبصورت دُنیا کے جسم پر ایک تھپڑ لگا تھی! اس نے پہلے مجھے سُونگھا پھر ماحول کو سُونگھا اور جیسے اُسے احساس ہوا کہ ماحول نامکمل ہے۔ اس لئے اُس نے میرے بیڈ کے سرہانے ایک میلے سے گتے پر میڈیکل چارٹ لٹکا کر ماحول کو مکمل کر دیا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری قبر پر دیا جلا دیا ہو!

میری بیماری اچھلتی کودتی، چھلانگیں لگاتی ہوئی جب کئی ہفتے عبور کر گئی تو مجھے شک ہونے لگا کہ ڈاکٹر حضرات کو خدمتِ خلق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی حالت اس عورت سے بہتر نہیں ہے جو شوہر کے لئے کھانا تیار کرتی ہے۔ شام کو سبزی وغیرہ لاتی ہے اور صبح دودھ کے ڈپو کی لمبی قطار میں دو بوتلیں لانے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتی ہے ——— عام اصطلاح میں اسے گرہست کی خدمت کہا جاتا ہے لیکن گرہستن سے پوچھا جائے تو وہ اسے اکتا دینے والی روٹین (ROUTINE) کا نام دیتی ہے ———!

میرا خیال تھا اور افسوس ناک حد تک غلط خیال تھا کہ ڈاکٹر جب مریض کی خدمت کرتے ہیں تو اسے انسانیت کا عروج سمجھتے ہیں۔ لیکن جب میں نے ذرا قریب ہو کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا وہ انسانیت سے اکتا چکے ہیں۔ وہ جب مریض کا بلڈ پریشر دیکھتے ہیں یا اس کے ہارٹ اور جگر اور پھیپھڑے کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آلو چھیل رہے ہوں یا سبزی میں نمک مرچ مسالے کا تناسب پیدا کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر سچ مچ ایک انار ہوتے ہیں جس کے ایک سو نہیں ہزاروں بیمار ہوتے ہیں۔ ہر بیمار سمجھتا ہے۔ یہ انار میرے ہی کھانے کے لئے ہے اور ڈاکٹر کی بے بسی یہ ہے کہ وہ کسی مریض سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ دوست! انار کے متعلق تم جو بھی نقطۂ نگاہ بنالو، میں دخل نہ دونگا لیکن ظالم! مجھے پانچ منٹ کی تنہائی تو عطا کر دو تاکہ میں خدمتِ خلق سے بلند ہو کر ایک سگریٹ پی سکوں "

ایک دن میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھ لیا "ڈاکٹر صاحب! آپ کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ کیوں مر گیا؟"

وہ جیسے دو دُونی چار کا پہاڑا پڑھتے ہوئے بولا "وہ تو اسی دن مر گیا تھا جب میں نے اس ہسپتال میں نوکری کے لئے برسوں اپنے گھٹنے اور ماتھا رگڑا۔ ایک نہایت ہی بھونڈے، غیر انسانی شکل کے ڈپٹی منسٹر کو وقت کا جہانگیر اور یوسف کہا تھا۔ انسانیت تو اس سماج کے لئے اچھوت کا درجہ رکھتی ہے!"

یہ سُن کر مجھے شک ہوا کہ میرے بھی جذبے اچھوت ہیں۔ ڈاکٹر میرے جذبوں کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتا۔ وہ صرف ہسپتال کے مُردہ قاعدے قانون کے چوکھٹے میں گھومے جا رہا ہے۔ اس چوکھٹے کے باہر کی دنیا اچھوتوں کی دُنیا ہے۔ اس چوکھٹے میں انسانیت داخل نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر اس چوکھٹے سے باہر آکر اچھوتوں کو چھُونا نہیں چاہتا۔ جو مریض ہسپتال میں اس خیال سے داخل ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اس کا انتظار کر رہا ہے اور لپک کر مریض کے جسم میں خدمتِ خلق کا انجکشن دے دے گا اور ناچ اٹھے گا۔ ایسے مریض کو چاہیئے کہ وہ اچھوت ہی رہے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر کے لئے سب مریض برابر ہیں، سب بور ہیں، سب اچھوت ہیں!

بھونڈے ڈپٹی منسٹر نے ڈاکٹر سے انسانیت چھین لی۔ اب تو وہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے بھی پیار کرنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اس کی تنخواہ کتنی ہے؟

احباب اور رشتے داروں تک میرے وارڈ اور بیڈ نمبر کی باقاعدہ اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ ایک دوست نے خلوص کی بلندیوں پر کھڑے ہو کر

مشورہ دیا کہ بیڈ نمبر اخباروں میں چھپوا دیا جائے۔ چھپ جانے کے بعد وہ اپنے فرضِ منصبی سے چھٹکارا پا گئے اور پھر کبھی ہسپتال میں نہ آئے۔ باقاعدہ اطلاع کے باوجود (سُنا ہے) یار دوست ایک دوسرے سے پُوچھتے پھرتے ——— "بھائی! فکر صاحب کا بیڈ نمبر کون سا ہے؟"

شروع شروع میں خلوص کے ماروں کی آمد زوروں پر رہی۔ اُن کی آمد پر میرا دل بلیوں اُچھلتا اور میں بھُول جاتا کہ میں بیمار ہوں۔ ہر ملاقاتی یہ جھوٹ بول کر بہت خوش ہوتا ——— "اجی آپ تو بالکل بھلے چنگے ہیں ورنہ ایسے اعصابی امراض میں تو انسان ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے!"

جوں جوں وہ میرا دل بڑھاتے، میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا چلا جاتا۔ لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا، میری ہڈیوں کی مزید تعداد نمایاں ہوتی چلی جائے تاکہ میں پرسانِ حال کی محبت کے لذیذ جام لنڈھاتا رہوں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ میری اس سازشی پلاننگ کا علم احباب اور رشتے داروں کو ہو گیا اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں، ایک میڈیکل چارٹ اور ایک بیوی رہ گئی! شاید پرسانِ حال نے میرے مرض کی بُو سُونگھ لی کہ یہ مرض طولِ شبِ فراق کی مانند بڑھ گیا ہے اور زندگی صرف مرض کے گرد تو نہیں گھومتی۔ کئی اور اہم کام بھی ہیں۔ مثلاً پتنگ اڑانا ہے، بلیک مارکٹنگ ہے، لڑکیوں سے چھیڑ کرنی ہے، پڑوسیوں سے لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔ غرض سینکڑوں ضروری کام ہیں۔ فکر تونسوی کا مرض زندگی کا ایک حقیر سا حصّہ ہے۔ ایک گھٹیا سی روٹین (ROUTINE) ہے۔ ہُنہ ——!

سینکڑوں مریض ہر روز صبح ہسپتال کی او۔ پی۔ ڈی کی کھڑکی کے سامنے کیو

بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھلا بیمار ہونا بھی انسان کی کوئی بنیادی ضرورت ہے ——— !

اور یوں آہستہ آہستہ میں غیر دلچسپ ہو گیا۔ ہمدردی اور خلوص کا سیلاب ایک دم تیزی سے شام کے سورج کی طرح ڈوب گیا۔ یہاں تک کہ ڈوبتی شعاعوں کی سرخی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ مرض کو عادت نہ بنانا چاہیئے۔ اتنی بڑی کائنات ہے اور ایک انسان اس میں ایک بے حد مدّھم ہوتا ہوا نقطہ ہے جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی لکیر نہیں بنتی۔ اس حقیر نقطے پر انسانیت اور محبت اور خلوص وغیرہ وغیرہ چیزوں کی بنیاد رکھنا خالی خولی جذباتی پن ہے۔

بمبئی سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا ——— "تم بڑے خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو اور (سُنا ہے) تمہارے پُرسانِ حال تمہاری اس بیماری کو غنیمت سمجھ کر جوق در جوق تمہیں پوچھنے کے لئے بھی آتے رہتے ہیں لیکن میری بدبختی! کہ میں بمبئی میں بیمار پڑا ہوں۔ جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کس حال میں ہے؟ یہاں کا ہر فرد اپنے بدن کی مختصر سی دُنیا کے باہر دیکھ ہی نہیں سکتا! میں سمجھتا تھا ان کے پاس جذبات کی کمی ہے، لیکن اب معلوم ہوا ہے، فرصت کی کمی ہے۔ جتنے وقت میں وہ مجھے پوچھنے کے لئے آئیں، اتنے وقت میں وہ اپنے مالک مکان سے تو تو میں میں کر سکتے ہیں جو میری بیماری کی خاطر ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ چھ ماہ سے اپنے گھر میں پڑا ہوں اور کسی پُرسان حال کو ترس گیا ہوں! کل کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا تو میں بے حد جذباتی ہو گیا کہ آخر کسی پُرسانِ حال کے دل میں خلوص جاگا میں اَٹنشن ہو گیا اور مریضوں کی طرح ہانپنے کرنے لگا۔ نووارد نے پوچھا۔

—— "صاحب! کیا بات ہے۔ آپ تو کچھ بیمار معلوم ہوتے ہیں کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیے، جلدی تندرست ہو جائیے کیونکہ ہندوستانی ادب کو ابھی آپ سے بہت اُمیدیں ہیں۔ میں نے بائی دی وے آپ کے گھر میں ایک ضروری ٹیلیفون کرنے آیا تھا۔ اجازت ہو تو کر لوں؟"

بمبئی کے اس دوست کے خط سے مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہیئے تھا لیکن میرے پاس تھیٹر کے ایک پروڈیوسر دوست بیٹھے تھے اس لئے میں نے جذباتی ہونا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ کہہ رہے تھے "فکر صاحب! آپ تو بیماری سے چمٹ ہی گئے ہیں۔ مَیں پوچھنے آیا تھا کہ وہ ڈرامہ جس کے ابھی تین منظر قلم بند کرنا باقی ہیں، ان کا کیا بنے گا؟ ڈرامے کا مکمل ہونا تو بے حد ضروری ہے"۔

"جنابِ من! ڈرامے سے زیادہ میری بیماری ضروری ہے۔ مَیں تو غسلِ صحت کے بعد ہی وہ سین لکھ سکوں گا"۔ میں نے کہا۔

"آپ جلد جلد تندرست ہو جائیے۔ ہمارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ لیجئے، آپ کے لئے آلو بخارا لایا ہوں۔ کھائیے اور سوچئے کہ کیا دورانِ مرض آپ ڈرامہ مکمل نہیں کر سکتے؟"

دُنیا ستم گر نہیں ہے بلکہ اس کی مجبوری ہے کیونکہ اُسے مرض سے زیادہ اپنے ڈرامے سے محبّت ہے اور محبّت کے بغیر وہ سانس نہیں لے سکتی۔

ایک نزدیکی رشتے دار (کم از کم وہ بدستور مجھے رشتے دار کہتے تھے) بہت سنجیدہ غم اپنی پلکوں پر تھرتھراتے ہوئے میرے بیڈ کے پاس آئے، میڈیکل چارٹ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور بولے "خدا چاہے گا تو آپ بہت جلدی صحت یاب ہو جائیں گے"۔

میں نے عرض کیا ۔ "آپ کو اتنی کیا جلدی ہے ؟"

وہ روہانسے ہو کر بولے ۔ "آپ بیماری میں بھی مذاق سے باز نہیں آتے ۔ آپ کی بھتیجی کے بیاہ کا مسئلہ تھا ۔ آپ کی بیماری کے باعث اٹکا ہوا ہے ۔ تاریخ مقرر کرنا ہے ، لڑکے والے بہت پریشان کر رہے ہیں ۔ آپ جانتے ہیں ، کل جُگ ہے ، کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی ۔"

مَیں نے ان سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا "غلطی میری تھی کہ کل جُگ میں بیمار ہوا ۔ آپ بیاہ کر دیجیے ، میری بیماری پر بھروسہ مت کیجیے !"

چند دن بعد معلوم ہوا ، انھوں نے بیاہ کر دیا ہے ۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا ۔ جسے میں ان کے دعوتی کارڈ پر گرا سکتا ۔ البتہ میں نے ایک دانش مندانہ قدم ضرور اٹھایا کہ ہسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آ گیا ۔ پُرسانِ حال پر بھروسہ کر کے بیمار رہتے چلا جانا مجھے غیر ضروری معلوم ہوا ۔

گھر آ کر ایک اور قریبی رشتے دار کا پیغام ملا کہ میرا بڑا لڑکا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا ۔ اس پریشانی میں آپ کو پوچھنے کے لئے حاضر نہ ہو سکا ۔ ایک دس سالہ پُرانے دوست نے کاغذ کی ایک چٹ لکھ کر بھجوائی کہ میں تمہارے ہجر میں تڑپ رہا ہوں ، ہسپتال میں نہیں آئے تو گھر پر ہی آ جاؤ ! اس نے اسی چٹ کی پُشت پر جواب دیا ۔ "اب تم نے مجھے شرمندہ کر سکنی ٹھانی ہے اس لئے میں تمہیں شکل نہیں دکھا سکتا ۔ میں تمہیں نارمل حالت ہی میں دیکھ سکتا ہوں ۔ بیمار حالت میں تمہیں دیکھنا میری قوتِ برداشت سے باہر ہے ۔"

ایک اور دوست سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوئی ۔ ہنس کر بولے "میں نے سُنا تو ضرور تھا کہ تم بیمار ہو ، لیکن میں نے سوچا ۔ مذاق کرنا تمہاری

عادت ہے۔ شاید تم نے بیماری سے بھی مذاق کیا ہوگا۔ اب کیسے ہو؟"

اس کے بعد میں ہر رشتے دار اور دوست کے گھر جاکر اطلاع دے آیا کہ میں اب بھی بیمار ہی ہوں۔ اس لئے موقع غنیمت ہے، آکر میری پرسش حال کر جاؤ۔ ایک صاحب الٹے مجھ سے شکایت کرنے لگے "واہ فکر صاحب! آپ نے بھی کمال کر دیا! میں ہسپتال میں آپ کی صورت حالات پوچھنے کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا، آپ ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے ہیں۔ آخر اتنی بھی کیا جلدی تھی؟" ایک دوسرے رشتے دار کو دوسری شکایت تھی۔ کہ میں ہسپتال میں دو گھنٹے تک ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں آپ کو ڈھونڈتا پھرا، لیکن ناکام لوٹ آیا۔ کم از کم یہ بتا دیتا تو آپ کا فرض تھا کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹوٹی بلکہ اعصابی نظام ٹوٹا ہے۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ موقع ملا تو ہڈی ہی تڑواؤں گا اور ہسپتال سے باہر آکر میں نے محسوس کیا کہ دنیا ویسی کی ویسی ہی ہے، کسی کو کسی سے دلچسپی نہیں۔ ہر آدمی ایک دوسرے کے ساتھ قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ ان کی محفل میں کون آیا، کون گیا، کون مر گیا، کس کی ہڈی ٹوٹ گئی، کس کی آنکھ پھوٹ گئی، کون دیوالیہ ہو گیا، کس کی لاٹری نکل آئی؟ ان تمام تبدیلیوں سے بے نیاز اس دنیا کا ہر آدمی اپنے ہی چند سانسوں میں مگن ہے اور مجھے بھی اپنی ان محفلوں میں انھوں نے یوں کھپا لیا جیسے میں کبھی بیمار نہ ہوا تھا اور جیسے میں ان کی خاطر بیمار نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے بدن کی آزمائش کرنے کے لئے بیمار ہوا تھا۔

البتہ پرسانِ حال اب بھی شاید خلوص و محبت کے مارے مجھ سے میری صحت کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں اور اس بات پر بہت افسوس کا

اظہار کرتے ہیں کہ میں نہایت غلط دوائیں لیتا رہا۔ وہ مجھے مشورہ دیتے ہیں مختلف نسخے بتاتے ہیں کہ میں ان پر عمل کروں تو بالکل تندرست ہو جاؤنگا۔ بلکہ ایک دوست تو مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرے ہاتھ میں دوا کی ایک شیشی تھماتے ہوئے بولے "اِسے استعمال کیجئے۔ تیر بہدف ہے!"

"آپ نے ڈاکٹری کا یہ فن کہاں سے سیکھا؟" میں نے ان سے پوچھا۔

وہ گردن پھلا کر بولے "اجی میرے والد صاحب عطّار تھے!" اور میں گردن جھکا کر گنگنانے لگا ؎

میر بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں
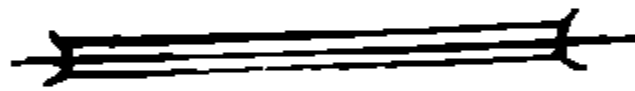
ماسٹر چرٹ لال نے فلم بنائی!

ماسٹر چرٹ لال سے میرے تعلقات نہ رقیبانہ ہیں اور نہ عاشقانہ بلکہ ان دونوں کے بیچ بیچ کے کچھ تعلقات ہیں جو ابھی ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے اور نہ ہم نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی ——— سنا ہے شرفا میں اسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔

جب بھی وہ میرے گھر میں آتے ہیں میں انہیں چائے پلا دیتا ہوں اور میں ان کے گھر جاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ بھی جواباً مجھے چائے پلا دیں گے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے چائے کے ساتھ بسکٹ بھی کھلا دیئے تھے چنانچہ دوسری مرتبہ جب وہ میرے گھر آئے تو میں نے بھی انہیں چائے کے ساتھ بسکٹ کھلا دیئے ——— غرض ہم اس طرح ایک دوسرے کے گھر چائے، بسکٹ، سگریٹ، پان کوکا کولا کا استعمال کرتے رہتے ہیں اور پھر کھانے پینے اور باتیں کرنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک

عجیب سا خالی خولی پن، ایک بے معنی سی محرومی ہم دونوں کے درمیان قائم رہتی ہے ۔ اگرچہ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس پر نہ ہم ٹھنڈی آہ بھرتے ہیں نہ اداس ہوتے ہیں ۔

یعنی ماسٹر جرأت لال سے میرے تعلقات دو دونی چار کے پہاڑے کی طرح ہیں جو ہم ایک دوسرے کو سناد یتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ فکر صاحب، کیلا کھانے سے قبض ہو گئی تھی ۔ میں ماسٹر جی کو بتاتا ہوں کہ سورج کو میں نے ہمیشہ مشرق سے آگتے دیکھا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلقات خوشگوار چلے آرہے ہیں ۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کیلا اور سورج نہ ہوتا تو ہمارے تعلقات دگرگوں ہو گئے ہوتے ۔

لیکن ایک دن اچانک ہمارے تعلقات میں دراڑ پڑ گئی، کیوں کہ قانون قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو اُن جانے میں بے وقوف بناتے رہیں ۔

ہوا یہ کہ ایک دن ماسٹر جرأت لال نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا ——
"فکر صاحب! میں مشہور ہونا چاہتا ہوں !"

میں نے عرض کیا :" آپ کو ضرور مشہور ہونا چاہیئے، ورنہ آپ ہمیشہ کیلا بنے رہیں گے اور اپنے آپ کو قبض نہیں ہونے دینگے ۔"

وہ بے تحاشہ ہنس دئے لیکن فوراً بعد جیسے انہیں خیال آیا کہ وہ اپنی ہی سنجیدہ بات پر ہنس رہے ہیں ۔ چنانچہ ایک دم اداس یعنی سنجیدہ ہو کر بولے ۔
"آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں ۔"

میں نے کہا :" نہیں! یہ میری عادت ہے، نیت نہیں ۔ آپ فرمایئے کہ مشہور ہونے کے لئے آپ نے کونسا طریقہ سوچا ہے ؟ مثلاً گذشتہ دنوں ہمارے

محلّے کے ایک صاحب نے مشہور ہونے کی خاطر اپنی گلی کے سرے پر اپنے نام کی تختی پر لکھ کر لگا دیا ۔ "پرکاش چند اسٹریٹ" لیکن ان کی شہرت اس وقت خطرے میں پڑ گئی جب اسی گلی میں ایک کرایہ دار آکر رہنے لگا ۔ اس کا نام بھی پرکاش چند تھا ۔ چنانچہ انھوں نے وہ تختی اتار لی ۔ اور پینٹر سے نئی تختی پر لکھوا دیا ——— "پرکاش چند ملہوترہ اسٹریٹ" ——— اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مشہور ہونے سے پہلے یہ تحقیق ضرور کر وا لیجئے کہ اس شہر میں کسی اور آدمی کا نام تو ماسٹر چرنت لال نہیں ہے اور وہ آپ کی طرح ملہوترہ تو نہیں ہے ۔"

انھوں نے اپنے ماتھے پر اپنی استخوانی انگلیاں دو چار مرتبہ ماریں اور جیسے سارے شہر کا چکر لگا کر ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آئے ۔ پھر بولے ۔

" صرف ایک ماسٹر چرنت لال ضرور ہے مگر وہ اسٹیشن ماسٹر ہے اور میں اسکول ماسٹر ہوں ، اور پھر وہ صرف اس لئے مشہور ہے کہ اس کی سات لڑکیاں ہیں اور لڑکا ایک بھی نہیں ہے ۔"

میں نے ان کی پیٹھ پر اطمینان دلانے والی تھپکی دی ۔" خیر ، ان کی مشہوری کی لائن الگ ہے ، مگر آپ کی لائن کیا ہے ؟"

" میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں " ۔ وہ واقعی مطمئن ہو کر بولے ۔

" ضرور بنائیے ! اور اس فلم کا نام اسکول ماسٹر رکھیئے ۔"

انہیں پھر شک ہوا کہ میں طنز کر رہا ہوں ۔ بولے " فکر صاحب ! آپ پھر مذاق اڑا رہے ہیں ۔ لیکن بچپن سے یہ میری تمنا ہے کہ میں زندگی میں ایک فلم ضرور بناؤں گا ، اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس خواب کی تعبیر ضرور نکلے گی ۔"

" ہائے ! بچپن کے سہانے خواب !" میرے منہ سے بے اختیار نکلا ۔ مگر انھوں نے میری بات شاید نہیں سنی اور بتاتے چلے گئے کہ میں نے فلم کے لئے ایک

کہانی بھی لکھ ڈالی ہے اور اس کا نام بھی رکھ لیا ہے ۔ "دو بوٹے ایک گلاب"۔

اب میں سنجیدہ ہو گیا اور کہا ۔ "ماسٹر جی، اس نام سے ملتی جلتی ایک دو فلمیں پہلے بھی بن چکی ہیں بلکہ ایک پروڈیوسر تو اسی قسم کے نام سے ایک مزاحیہ فلم بھی بنا رہا ہے "ایک سیخ دو کباب"۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ کوئی چونکا دینے والا نام رکھیئے"۔

"تو آپ ہی کوئی نام تجویز فرمائیے"۔ انہیں مجھ پر جاہلانہ حد تک اعتقاد تھا۔ جیسے مجنوں کے ٹیلے کے مجاور کو اس امر پر اعتقاد تھا کہ اس ٹیلے کے نیچے واقعی مجنوں کو دفنا دیا گیا تھا۔

میں نے کہا "پہلے آپ اپنی کہانی سنائیے! تب ہی اس کا کوئی معقول یا نامعقول نام تجویز کیا جا سکتا ہے، اگرچہ آجکل کی دنیائے فلم میں یہ ضروری نہیں ہے کہ کہانی کی تھیم اور فلم کے نام میں کوئی تعلق ہو لیکن چونکہ آپ ایک معیاری فلم بنانا چاہتے ہیں اور غضب یہ کہ اس کی بدولت مشہور بھی ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ کی کہانی کی روح فلم کے نام میں پوری طرح اجاگر ہونی چاہیئے"۔

انھوں نے شاید مجھے پروڈیوسر یا فنانسر یا دونوں سمجھ کر کہانی سنانا شروع کی اور بولے "میری کہانی ایک باغیچے سے شروع ہوتی ہے، جہاں پر ایک مالی کا لڑکا اور ایک سیٹھ کا لڑکا آپس میں گیند بلا کھیل رہے ہیں اور ......"

مجھ سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "میں سمجھ گیا چرٹت لال جی! آپ کی فلم میں یہ دونوں لڑکے بڑے ہو کر جوان ہو جائیں گے اور دونوں ایک ہی لڑکی سے عشق کرنے لگیں گے .... اور پھر دونوں اس لڑکی کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک لڑکا کسی حادثے میں مر جائے گا یا مار دیا جائے گا اور دوسرے لڑکے سے وہ لڑکی شادی کر لےگی۔

کہانی ختم، فلم ختم' اور پھر آپ کو نیشنل ایوارڈ ....''

ماسٹر چرٹ لال ایک دم اداس ہو گیا' اور جیسے میلوں کی مسافت طے کرکے آنے والا مسافر تکان سے چور چور آواز میں بولتا ہے ۔" میں نے یہ کہانی لکھنے پر پورے گیارہ مہینے عرق ریزی کی مگر آپ نے ڈیڑھ منٹ میں ہی ساری کہانی سنادی ...... مگر معاف کیجئے' میری کہانی میں ایک نہیں' دو لڑکیاں ہیں۔

میں اچھل پڑا ۔" پھر تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا ۔ ماسٹر چرٹ لال جی' ہندوستان بھر کی لڑکیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں' آپ چاہیں تو دو کی بجائے چار پانچ لڑکیاں بھی لا سکتے ہیں' لیکن ہیروئین تو بہرکیف ایک ہی لڑکی ہوگی۔"

" نہیں! میری فلم میں دو ہیروئنیں ہوں گی ۔ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ...."

" جو مالی کے لڑکے سے عشق کرے گی تاکہ ملک میں سوشلزم ......"

" اور دوسری ایک غریب طوائف کی لڑکی' جس کے لئے سیٹھ کا لڑکا اپنے والدین کی جائداد پر لات مار دے گا ......"

" بس بس!" میں نے ماسٹر چرٹ لال کا منہ چوم لیا " آپ سچ مچ ایک عظیم آدرش پر فلم بنا رہے ہیں کہ امیروں کو غریبوں سے عشق کرنا چاہیئے اور غریبوں کو امیروں سے' تاکہ ملک میں حقیقی سوشلزم آسکے ۔ میرا مطلب ہے کہ کم از کم فلموں میں تو سوشلزم آ ہی جانا چاہیئے .... آپ اس کہانی کو فوراً سے پیشتر فلما دیجئے' میری طرف سے اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ کیونکہ یہ ایک غیر شریفانہ فعل ہوتا' اگر ماسٹر چرٹ لال کی کہانی میں ترمیم و تنسیخ کے مشورے دیتا اور خود بھی دکھی ہوتا اور ماسٹر جی کے نازک بھیجے پر بھی چھری چلاتا ۔ البتہ جاتے جاتے میں نے ماسٹر جی سے یہ ضرور کہہ دیا کہ ان میں سے ایک لڑکے یا ایک لڑکی کو کسی حادثے یا جھگڑے

میں مرو امت ڈالیئے بلکہ ان دونوں جوڑوں کی خوشگوار شادی کروا ڈالیئے۔
کیونکہ ملک کو اس وقت خوشحال شادی جوڑوں کی اشد ضرورت ہے!
ماسٹر جی نے سچ مچ مجھ سے وعدہ کرلیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ حالانکہ
اگر وہ اپنی فلم میں سیٹھ کے لڑکے کو عمر قید دلوا دیتے اور اس کی محبوبہ کو جوگن
بنا کر ہند صیاچل پہاڑ کی طرف بھیج دیتے، تو بھی مجھے کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا کیونکہ
فلموں میں ایک فارمولا استعمال کیا جائے یا دوسرا فارمولا، انجام ہر فلم کا یہی ہوتا
ہے کہ فنانسر کو منافع مل جاتا ہے اور فلم اسٹار گورنمنٹ کا انکم ٹیکس دبا لیتے ہیں
اور نیشنل ایوارڈ پانے کے اہل ہو جاتے ہیں۔

آٹھ دس دن بعد ماسٹر جرأت لال اچانک پھر نمودار ہو گئے۔ میں نے
پوچھا۔ "سنائیے ماسٹر جی! آپ کی فلم کس منزل میں ہے؟"
اس دن ان کے افسوسناک قسم کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق چھائی
ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ۵۵۵ کے سگریٹ کا ٹین تھا اور سوٹ بھی نیا نیا ڈرائی
کلین کیا ہوا تھا۔ مسلمہ احمقوں کی طرح جیسے ڈانس کرتے ہوئے بولے ——————
"فکر صاحب! مبارک ہو، ایک فنانسر مل گیا ہے، جو اس فلم پر چار لاکھ روپے
صرف کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ کہانی اسے پسند آگئی ہے۔"
میں نے پوچھا "مبارک باد کے بعد عرض ہے کہ فنانسر کون ہے؟ (وہ
بھی کوئی مسلمہ احمق ہی ہوگا) کیا کام کرتا ہے؟"
وہ سرگوشی میں بولے "کسی کو بتائیے گا نہیں، وہ بلیک مارکیٹیا ہے۔ اس
کے پاس دس بارہ لاکھ روپے کا کالا دھن ہے، اور وہ بھی بطور فلم پروڈیوسر مشہور

ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے چوری چھپے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بظاہر خوش ہو کر کہا——
"ماسٹر جی! آپ نے پروڈکشن کے لئے نہایت مناسب آدمی کا انتخاب کیا ہے ہمارے ملک کی یہی رگھوکل ریت چلی آئی ہے کہ آرٹ اور لٹریچر کی خدمت اور سرپرستی صرف بلیک مارکیٹر ہی کرتے رہے ہے۔ فلموں کے ذریعے سوشلزم لانے کا سہرا صرف کالے دھن والوں ہی کے سر بندھے گا ——— تو آپ کب تک بمبئی جا رہے ہیں، کیونکہ فلم سازی کا مرکز تو بمبئی میں ہے۔"

وہ بولے "اوہ! مگر بمبئی روانہ ہونے سے پہلے میں آپ سے یہ مشورہ کرنے آیا ہوں کہ فلم کے لئے ہیرو کس کو لیا جائے؟"

"کسی کو بھی لے لیجئے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "روپیہ ہاتھ میں ہو تو آپ کسی بھی فلم اسٹار کی روح یا جسم خرید سکتے ہیں۔ راجندر کمار، راج کمار، پریم کمار، انوپ کمار کوئی بھی کمار آپ کی فلم میں ہیرو بن سکتا ہے۔
لیکن آپ کی فلم میں تو دو ہیرو تھے نا؟ ایک مالی کا لڑکا، ایک سیٹھ کا لڑکا۔ اس طرح تو خرچ دگنا ہو جائے گا۔ آپ یوں کیجئے، کہانی میں ترمیم کر لیجئے اور ایک ہیرو کو فلم کے پہلے ہی سین میں کسی نہ کسی طرح مروا ڈالئے۔"

"نہیں، فنانسر کا کہنا ہے کہ وہ اس فلم پر چار لاکھ کی بجائے آٹھ لاکھ روپے خرچ کر دے گا۔"

"ہپ ہپ ہرّے"! میں نے داد کی مرلی بجائی۔ "اور اگر وہ آٹھ لاکھ کی بجائے بارہ لاکھ روپے خرچ کر ڈالے تو فلم میں تین ہیرو رکھ لیجئے۔"

"مگر کہانی میں پھر تبدیلی کرنی پڑے گی۔"

"ہرج بھی کیا ہے، کالا دھن جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہر نکل کر

عوام میں تقسیم ہوگا۔ اتنی ہی جلدی ملک میں سوشلزم آئے گا اور جناب! ذرا اندازہ لگائیے کہ جب آپ کی فلم میں تین تین مشہور ہیرو ہوں گے اور تین تین ہیروئنیں تو جنتا بکنگ آفس پر ٹوٹ ٹوٹ پڑے گی۔ بارہ لاکھ کے چوبیس لاکھ بن جائیں گے اور آپ کی شہرت تین گنا بڑھ جائے گی۔"

ایک ہفتے بعد ماسٹر چڑت لال پھر میرے پاس یہ خوشخبری لے کر آئے کہ میرا فنانسر بارہ لاکھ روپے کی بجائے چودہ لاکھ روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ فلم ایسٹ مین کلر میں بنائی جائے گی۔ اس لئے اب آپ بتائیے کہ کہانی میں تیسرا ہیرو کس طرح پیدا کیا جائے۔"

میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا۔ (کیونکہ بغیر سوچے سمجھے جو فلمیں بنائی جاتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں) کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اس فلم میں ایک ویلن کو شامل کر دیجئے۔ کیونکہ ویلن بھی مرتبے میں ہیرو سے کم نہیں ہوتا۔"

مگر ماسٹر جی سوچ میں پڑ گئے۔ چند سیکنڈ تک اپنی پیشانی پر انگلیاں بجاتے رہے، جیسے سوشلزم اور ملک کا مستقبل ان کی پیشانی کے اندر پھنس گیا ہو، اور پھر غمگین لہجے میں بولے۔ "مگر فکر صاحب! میں نے تو یہ سوچا تھا کہ سیٹھ کے لڑکے کو ویلن کے روپ میں پیش کیا جائے یعنی ویلن تو فلم میں پہلے سے موجود ہے۔"

میں نے دست بستہ عرض کیا۔ "ایک کی بجائے دو ویلن بنا دیجئے آپ کا کیا بگڑتا ہے؟"

"لیکن دو ویلنوں کو فلم میں مروانا پڑے گا۔"

"مت مروائیے، آپ تو خدا ہیں۔ جلانا اور مارنا آپ کے اختیار میں ہے۔

عام فلموں کے راستے سے ذرا ہٹ کر فلم بنائیے اور آخر میں دونوں ولینوں کی شادی کرا دیجیے۔"

"مگر فکر صاحب!" وہ پریشان ہو گئے۔ "ولین کیسے شادی کر سکتے ہیں، شادی تو آخر میں ہیرو کی ہونی چاہیئے۔"

"افوہ! آپ سمجھے نہیں۔ فلم کے پہلے حصے میں ولین کو بہ طور ولین پیش کیجیے۔ دوسرے حصے میں وہی ولین اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے اور ہیرو بن جائے۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ سرودے لیڈر ونوبا بھاوے جی نے تالیف قلوب کے سلسلے میں ایک تحریک چلائی تھی اور مدھیہ پردیش کے ڈاکوؤں کے دل تبدیل کروا دئیے تھے، تو کیا آپ کے ولین پشچاتاپ نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں"۔ وہ ایک مجبور اور محبوس پنچھی کی طرح بولے۔

"تو بس، اب جائیے اور کہانی میں یہ نئی ترمیم کیجیے۔ میری دعائیں اور فنانسر کا دھن آپ کے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد ماسٹر چرنت لال جی کئی بار مجھ سے ملتے رہے، کیوں کہ انہیں اپنی فلمی کہانی میں کئی بار ترمیمیں کرنا پڑیں۔ کئی بار میرے کہنے پر ترمیم کی ایک بار فنانسر کے کہنے پر، ایک بار فنانسر کے سالے کے کہنے پر، کیونکہ وہ سالا اس فلم میں بہ طور سائڈ ہیرو کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ سالے کی پانچ سالہ ننھی بیٹی کے کہنے پر، کیوں کہ اس نے ضد کی تھی کہ انکل مجھے اپنی فلم میں رول دے دیجیے۔ چنانچہ ننھی بچی کو "اکاموڈیٹ" کرنے کے لئے نصف کہانی دوبارہ لکھنا پڑی۔ ایک ڈسٹری بیوٹر کے کہنے پر، جو فنانسر کے سالے کا بہنوئی تھا اور اس

نے فلم میں دو لاکھ روپے لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے کہنے پر مالی کے غریب لڑکے کا عشق ڈانسر سے کروانا پڑا، کیونکہ اس بہنوئی کی بیوی ڈانسر تھی غرض ترمیم در ترمیم کے بعد جب آخری شکل میں کہانی مجھے سنائی گئی تو ماسٹر چرٹ لال کی حقیقی کہانی کی قبر کے اوپر کئی قبریں بن چکی تھیں اور اصلی قبر کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

بہرکیف ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ وہ عظیم فلمی کہانی کار ماسٹر چرٹ لال اپنے بیوی بچوں سے یہ کہہ کر بمبئی کی طرف روانہ ہو گیا ہے کہ میں جلد ہی بہ طور مشہور پروڈیوسر تمہیں بمبئی بلوا لوں گا۔

اس کے بعد دو مہینے تک ماسٹر چرٹ لال کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ماسٹر چرٹ لال نے ہندساگر میں خودکشی کر لی ہوگی اس خودکشی پہ مجھے صرف اتنا افسوس ضرور ہو گیا تھا کہ فلموں کے ذریعے سوشلزم آنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو جائے گی۔

مگر دو مہینے بعد اچانک ایک دن کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک مرجھایا ہوا چہرہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا "فرمائیے!"

وہ بولا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ماسٹر چرٹ لال ہوں۔"

میں نے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا "پہچانتا کیسے ماسٹر جی! آپ کے چہرے پر تو سوشلزم چھا گیا ہے۔ یہ سیاہی، یہ جھریاں، یہ جھانکتی ہوئی ہڈیاں! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

وہ بولا "مجھ سے سخت دھوکا کیا گیا فکر صاحب! میری وہ کہانی کسی دوسرے پروڈیوسر نے چرا لی۔"

"کیسے ؟ وہ کہانی تو پہلے ہی کئی فلموں سے چرائی ہوئی تھی - چرائی ہوئی کہانی کو کس نے چُرا لیا ؟ یہ بمبئی کے فلم ساز تو بڑے احمق ہیں!"

ماسٹر چرنجی لال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ جیسے فریادیوں کی طرح اپنی دردناک داستان سناتے رہے ـــ "بات دراصل یوں ہوئی کہ جب سارے معاملات طے پا گئے تو ہم نے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی - اسٹوڈیو، فلم اسٹار، دلال اور کئی دوسرے پیشہ ور ٹھگ مل جل کر ہمارا دو لاکھ روپیہ کھا گئے اور جب دو ریلیں بن گئیں تو اچانک ایک دن اسٹوڈیو کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا - معلوم ہوا کہ ہمارے فنانسر صاحب کے خلاف سرکار نے اسمگلنگ کا کیس بنایا ہے اور اس سلسلے میں اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے کیونکہ یہ سارا کالا دھن اس نے اسمگلنگ کے ذریعے کمایا تھا چنانچہ فکر صاحب! جب ہمارا فنانسر گرفتار ہو گیا تو فلم کی شوٹنگ رک گئی اور میں ....."

"..... آپ کی کہانی تو گرفتار نہیں ہو گئی - آپ اسے کسی اور پروڈیوسر کو دیدیتے۔"

ماسٹر چرنجی لال نے پانچ کلو میٹر لمبی آہ بھری اور کہا "یہی تو دکھ ہے فکر صاحب! کہ اس فنانسر کے سالے نے میری وہ کہانی اٹھا کر ایک اور پروڈیوسر کو سنائی تو معلوم ہوا کہ بالکل ایسی ہی کہانی وہی پروڈیوسر پہلے بھی خرید چکا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک فلم تیار کر رہا ہے - حیرت ہوتی ہے کہ میری یہ کہانی کس بے ایمان نے چرا کر اس پروڈیوسر کے ہاتھ بیچ دی۔"

میں نے ماسٹر جی کے کندھے پر شفقت سے تھپکی دی اور کہا "گھبرائیے نہیں ماسٹر جی! اب آپ ایک اور کہانی لکھئے - ہمت مت ہارئیے - آپ کے بچپن کا خواب ضرور پورا ہوگا - اس مکر و فریب کی دنیا میں آپ کو شہرت ضرور ملے گی - شہرت ملنے میں دیر ہوتی ہے، اندھیر نہیں"۔ ـــــــ

مَیں مالک مکان بنا

اور آخر بیوی کے اصرار پر میں نے وہ ڈیڑھ کمرہ کرایے پر اٹھا دیا۔ اس سے اگرچہ خاندان کی روایت ٹوٹ گئی۔ لیکن بیوی نے نئی روایت قائم کر دی۔ شادی کے بعد خاندان کی حیثیت بیوی کے مقابلے پر سیکنڈری ہو جاتی ہے۔

یہ ڈیڑھ کمرہ میری مناسب ضروریات سے زیادہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا مصرف یہ تھا کہ میرا بڑا لڑکا کبھی کبھی اس میں گھس جاتا اور اپنی محبوبہ کے کوشیٹہ پڑھا کرتا تھا، یا اس کے ایک تاریک گوشے میں کچھ خستہ قسم کی خاندانی دستاویزات پڑی رہتی تھیں جن کا میں خواہ مخواہ احترام کیے جا رہا تھا۔

میری ٹریجڈی یہ تھی کہ میں انسانیت کو کرایے داروں اور مالک مکانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا اصول ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق میری معلومات کافی ناقص تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے اصول کا معلومات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میرے کرایہ دار کا نام گجا نند تھا جو اگرچہ نامعقول نام تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک منسٹر کا سفارشی خط لایا تھا۔ اس لئے مجبوراً میں نے اخلاقاً کہا "گجانند جی! منسٹر تو سفارشی خط لکھ کر اپنا سوشلزم کا گزارا کر لیتے ہیں لیکن آپ کرایہ دار بن کر کیوں گزارا کرنا چاہتے ہیں ؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو بے حد مانوس تھی' اور بولا ——
"جناب! مجھے جیوتشی نے بتایا ہے کہ اس جنم میں تم مالک مکان نہیں بن سکتے۔ صرف اگلے جنم میں چانس ہے"۔

جواب میں معصومیت تھی جو مجھے پسند آئی۔ مصیبت یہ ہے کہ معصوم انسانیت کے راستے میں جیوتشی حائل ہیں۔ گجانند کے لہجے میں جو سادگی اور پاکیزگی تھی اس کی بنا پر میں نے پوچھا۔ "بھائی جان! آپ اتنے شریف اور مہذّب کیوں ہیں ؟"

وہ جھٹ بول اٹھا۔ "یہ خاندانی وراثت ہے۔ اس میں میرا کوئی دوش نہیں جناب !"

عجیب بات ہے۔ کئی ماں باپ ورثے میں مکان چھوڑ جاتے ہیں اور کئی صرف شرافت اور تہذیب ——— میں نے اسے سمجھایا "گجانند جی! دراصل کمرہ تو ایک ہی ہے۔ مگر میری بیوی نے ایک چق لگا کر اسے ڈیڑھ کمرہ بنا رکھا ہے تاکہ ڈیوڑھا کرایہ وصول کر سکے اور شرفاء کے لئے صرف ایک کمرے میں رہنا غیر موزوں ہے"۔

اور جواب میں اس نے جیسے میری ساری فلاسفی کی توہین کر دی اور کہا "اوّل تو مجھے شرفاء میں شمار نہ کیجئے اور اگر آپ شمار کرتے بھی ہیں تو اس کا انکشاف دوسروں پر نہ کیجئے"۔ اس کے علاوہ گجانند نے میری

بیوی کا ذکر اپنے خاندانی ورثے سے بھی زیادہ احترام کے ساتھ کر دیا کہ وہ بے حد معقول خاتون ہیں۔

اور میں بیوی کی معقولیت سے گھبرا گیا اور وہ ڈیڑھ کمرہ گجانند کے حوالے کر دیا۔

تین مہینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گجانند اس ڈیڑھ کمرے کو جنت سمجھ کر رہ رہا ہے۔ وہ اتنا مرنجان مرنج نکلا کہ محلے کے پانچ سات چوہے تک نقل مکانی کر کے جنت میں گھس گئے۔ شرفاء کی یہی ٹریجڈی ہوتی ہے کہ وہ چوہے اور انسان میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتے۔

ایک دن محلے کے تین چار معزز لوگ میرے پاس تشریف لائے تھے۔ میرا مطلب ہے، لباس سے وہ معزز معلوم ہوتے تھے۔ ایک نے کہا۔

"مبارک ہو فکر صاحب! آپ اب مالک مکان بن گئے ہیں!"

دوسرے نے وضاحت کی "جب تک کرایہ دار نہیں آیا تھا آپ مالک مکان کہلانے کے مستحق نہیں ہوئے تھے!"

تیسرے نے کہا "یعنی اب آپ میں ایک مفہوم پیدا ہو گیا ہے!"

چوتھے نے ایک فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اور اب آپ ہماری محلہ رنگ پورہ مالک مکان ایسوسی ایشن کے معزز ممبر بن جائیے!"

میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھا "اس ایسوسی ایشن کے جنم کا کوئی معقول یا نامعقول مقصد؟"

وہ بولے "بات یہ ہے جی! کہ یہ کرایہ دار لوگ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔"

"یعنی میرا کرایہ دار بھی بدمعاش ہے؟"

"نہیں ہے تو مر جائے گا۔ اسی لئے ہم مالک مکان آپس میں بھائی چارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے آج سے آپ ہمارے بھائی ہیں۔"

میرا جی چاہا اُنہیں کہہ دوں۔ کسی منسٹر کی سفارش لا دیجئے۔ جب آپ کا بھائی بنوں گا۔ لیکن یہ شرط بھونڈی معلوم ہوئی۔ کیونکہ اسے معزّزین آسانی سے پوری کر سکتے تھے۔ آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے۔ اگرچہ دستخط کے بعد اپنی حرکت پر بہت تعجب ہوا۔ چند دن پہلے میں نے گجانند کو بھی اپنا بھائی کہا تھا۔ اب مکان مالکوں کا بھی بھائی بن گیا ہوں۔ یہ دو متصادم قسم کے بھائی ......؟ لیکن پھر سوچا۔ اس دنیا کے سبھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔

اسی شام گجانند سے اطلاعاً عرض کر دیا کہ "آج سے آپ بھائی صاحب نہیں ہیں بلکہ کرایہ دار ہیں۔"

اور گجانند نے کہا۔ "چھوڑیئے جی! آپ تو مذاق کرتے ہیں۔"

لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بہت سیریس تھا۔ ایسوسی ایشن کا (معزز) ممبر بن جانے سے میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ اس لئے میں دن رات اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ گجانند کے کمرے سے کوئی آواز آ اٹھے اور میں چھت پھاڑ دوں۔ فرش پر پلنگ کھسکانے کی آواز، رات کو دیر سے آنے کی آواز، چوہوں کے گلاس توڑنے کی آواز، مہنگائی کے خلاف گالیوں کی آواز، یہاں تک کہ اُس کے بچوں کے رونے کی آواز بھی آتے تو میں للکار کر کہوں ——— "گجانند! اپنے بچوں سے کہہ دو، رونا بند کر دیں! کیوں کہ اس سے میرے بچوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان روتے بھی ہیں اور یوں

میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔"

لیکن ایسی کوئی آواز شاہد گجانند کے نصیب میں نہیں لکھی تھی ــــــ

ایسوسی ایشن کے معزز عہدیدار وقتاً فوقتاً میرے یہاں وِزٹ کرتے رہے اور مجھے بتاتے رہے کہ گجانند سے کون کون سی بدمعاشیوں کے امکانات روشن ہیں اور ان امکانات کا سدِّباب کرنے کے لئے تھانے کب جانا چاہیئے؟ گالیاں کب دینی چاہئیں؟ ہاتھ کب چھوڑنا چاہیئے؟ اور غنڈے بُلا کر انہیں شراب کب اور کیوں پلانی چاہیئے بلکہ ایک معزز عہدیدار کو تو اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ کرایہ دار کی وجہ سے ابھی تک آپ کی آتما کی شانتی میں خلل نہیں پڑا۔

میں نے اعتراف کیا کہ میری آتما میں کوئی نقص ہے۔

ایک دن ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ جن کی شکل بھونڈی اور لباس حسین تھا، تشریف لائے اور جیسے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں ہمدردی کرنے لگے ــــــ "نگر صاحب! ایسوسی ایشن کے معززین میں آپ کی قدر و منزلت بِکھ کم ہو رہی ہے بلکہ کچھ لوگ تو (معاف کیجئے) آپ کی نیت پر بھی شک کرنے لگے ہیں کہ آپ کی وجہ سے آپ کے کرایہ دار کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں جن کا اثر ان کے اپنے کرایہ داروں پر بُرا پڑ رہا ہے۔

میں نے عرض کیا "مگر پریذیڈنٹ صاحب! اسے میری ٹریجڈی سمجھئے کہ گجانند شریف اور مہذب انسان ہے۔"

وہ بولے "یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ کرایہ دار مہذب ہوتے ہی نہیں!"

"مگر وہ کوئی غیر مہذبانہ حرکت نہیں کرتا۔"

"کیسے نہیں کرتا؟ اچھا بتائیے غسل خانے میں جا کر گنگناتا ہے

کہ نہیں ؟"

"اُوں ہُوں "

"بڑا ڈل کرایہ دار ہے۔ آپ کرایہ دار بدل دیجئے!"

"ورنہ ؟"

"ورنہ معززین آپ کا سوشل بائیکاٹ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں"۔
یہ صریحاً دھمکی تھی مگر خاندانی ورثے کے باعث میں اس دھمکی کو چیلنج دینے کے اہل نہیں رہا تھا۔ اس لئے سوچ سوچ کر میں نے گجانند کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا اور بازار سے گالیوں کی ایک کتاب لے آیا اور ساری رات اس کی سٹڈی کرتا رہا۔

اور دوسری صبح کو اپنے نتھنے (وغیرہ) پھُلا کر گجانند کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔

"تم انسان نہیں ہو، اُلّو ہو!"

وہ حیران ہوا، جس سے مجھے خوشی ہوئی۔

"اور مَیں اُس اُلّو سے پوچھتا ہُوں۔ یہ کھڑکی کا شیشہ کس اُلّو کے پٹھے نے توڑا ؟"

"آپ کے چھوٹے صاحب زادے نے سہواً ایک ڈھیلہ عرض کر دیا"۔

"تو نالائق! تم نے اس کے باپ کو فحش گالیاں کیوں نہیں دیں ؟"

"اجی! میں نے سوچا۔ بچّے سب کے برابر ہوتے ہیں اگر میرا بچّہ ڈھیلہ مار دیتا تو ...... ؟"

مجھے بہت طیش آیا گویا اب یہ بچّوں کی ولدیت کو کنفیوز کر رہا ہے۔ بچّے سب کے بچّے ہوتے ہیں۔ سبھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں ہُنہ! نان سینس!

یہ کیسی دُنیا ہے ؟ کیسی اس کی فلاسفی ہے ؟ میں ٹوٹے ہوئے شیشے اور فلاسفی کی دُرگت پر بڑبڑاتا ہوا لوٹ آیا ۔ گالیوں کی کتاب آدھے دام پر فروخت کردی ۔ مجھے گجانند معزز نہیں بننے دیتا ۔ میرے الزامات کو احمقوں کی بڑ سمجھتا ہے ۔ ہُنہ ! پھُوں !

میں دو تین دنوں تک مشاہدہ کرتا رہا کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے ۔ تیسرے دن وہ اُلٹا مجھے راہِ راست پر لے آیا اور مکینک کو بلا کر اپنے پیسوں سے نیا شیشہ فٹ کروایا ۔ تاکہ میرے تلوؤں کو آگ لگ جائے ۔

جی چاہا اپنے چھوٹے صاحب زادے کو سَوا روپیہ رشوت دے کر کہوں کہ اس نئے شیشے کو بھی ڈھیلے مار کر چکنا چور کر دے ۔ لیکن وہ ناخلف نکلا ۔ کہنے لگا ۔ "گجانند مجھے انگریزی کے سبق اتنی خوبصورتی اور پیار سے پڑھاتا ہے کہ میں ناخلف بننا زیادہ پسند کروں گا ۔"

گویا یہ ایک سازش تھی ۔ وہ میرے بچے اور بچے کے باپ میں پھوٹ کا بیج ڈال رہا تھا ۔ ایسے آدمی کو کرایہ دار رکھنا اپنے پاؤں بلکہ اپنے خاندان کے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا ! سوچ سوچ کر میں نے اس سازش کا توڑ تلاش کر لیا ۔ دل ہی دل میں اس کی گردن پکڑ لی اور زبان ہی زبان سے کہا ۔ "اگلے ہفتے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہے اس لئے میرا کمرہ خالی کر دو ۔"

حالانکہ میرے بڑے لڑکے کو اس کے سائز کی ہر لڑکی مسترد کر چکی تھی ۔ اور وہ تنگ آکر سماج کی نِشکام سیوا کا پروگرام بنا رہا تھا ۔ لیکن شادی کی خبر سنتے ہی گجانند نے کہا ۔ "میں عزیزی رویندر کی شادی کی خوشی میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں !"

عجیب ہونق انسان ہے ۔ اُسے مکان خالی کرنے کا غم نہ تھا بلکہ میرے

بیٹے کے بیاہ کی خوشی تھی۔ یعنی اب میں اس کا سامان بھی زبردستی نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ غصّے میں آکر میں شام کو بالکونی پر کھڑا ہو گیا اور ساری دُنیا اور اس دنیا کو بنانے والے خُدا تک کو سنانے کے لئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"سُنیئے حضرات! یہ کیا بدمعاشی ہے، میرا کرایہ دار مجھے زخمی کرنے کے لئے کل رات غنڈے لے آیا۔ انھیں شرابیں پلائیں۔ لیکن میں اس غنڈہ گردی سے نہیں ڈرتا۔ میں اس کی ہڈّیاں چبا جاؤں گا! کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میری سالی کا بہنوئی ہے اور ڈپٹی کمشنر مجھ سے طالب علمی میں ریاضی کے سوال حل کرواتا رہا ہے۔ ہُنہ! میں اپنے لڑکے کی شادی پر اس سے کمرہ خالی کروا کے رہوں گا!"

یہ سُن کر آسمان سے پھولوں کی بارش نہیں ہوئی۔ البتہ ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ نے میرے اعزاز میں کاک ٹیل پارٹی کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان اس وقت دو آتشہ ہو گیا۔ جب میری جرأت رندانہ دیکھ کر محلّے کے چند مشٹنڈے کرایہ دار میری بالکونی پر چڑھ آئے اور گرجنے لگے ـــــ "کون مائی کا لال ہے! جو گنجانند سے کمرہ خالی کروالے! آپ کسی بھی کرایہ قانون کے تحت یہ غنڈہ گردی نہیں کر سکتے! ہم ڈپٹی کمشنر کے سبھی ریاضی کے سوالوں کو غلط قرار دے دیں گے جو ہم سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا!"

مجھے ان مشٹنڈوں کی جرأت پر خوشی ہوئی۔ گویا اب تنازعہ بڑھے گا۔ اور دو آتشہ لطف آئے گا۔ لیکن گنجانند نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ یہ میری واضح شکست تھی۔ میں بھاگا بھاگا اس کے پاس آیا اور اس کا کندھا زور زور سے جھنجوڑ کر بولا "ابے مُنّو کے تخم! مت جاؤ، اس کمرے کا کرایہ دُگنا کر دو اور جھک مار کر رہتے رہو!"

وہ چُپ رہا۔ منحوس کے دل میں میرا احترام زیادہ تھا۔

میں نے اس کے بال وحشیانہ انداز میں کھینچے "۔ ابے شیطان کی اولاد! مجھے انگوٹھا دکھا دو اور کہو کہ میں ایک چھدام نہ بڑھاؤں گا!"

وہ اسی طرح سامان باندھنے میں مصروف رہا۔

اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور پیمانے سے اچانک ایک قطرہ نکلا!

"گجانند! میں نے جھوٹ کہا تھا کہ تم نے غنڈے منگوائے تھے۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے!"

"یہ جھوٹ ہے کہ میرے لڑکے کی شادی ہو رہی ہے۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے"!

"میں نے دگنا کرایہ مانگ کر تم سے جھوٹ بولا۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے!"

اور دوسرے لمحے وہ میرے ہر جھوٹ کو پاؤں سے ٹھکرا کر چلا گیا اور میں بے قرار ہو کر سیدھا اس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی خاندانی دستاویزات پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں!!

بیوی کے ہجر میں

اچانک میری بیوی نے اعلان کیا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اب میں سسرال کو میکہ بھی سمجھتی ہوں اور ادھر میں کئی برس سے اصرار کر رہا تھا کہ میں تمہارے ہجر کی لذت اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس لئے تم کہیں دفع ہو جاؤ ...... لیکن وہ کہتی تھی کہ ہجر صرف ایک شاعرانہ تکلف ہے۔ اس سے میرا گھر اجڑ جائے گا۔ اگر میری غیر حاضری میں کچن کا ایک چمچہ بھی گم ہو گیا جو یقیناً گم ہو جائے گا۔ تو تاریخ میں میرا نام سیاہ حرفوں میں لکھا جائے گا۔

گویا وہ ہجر کو ایک چمچے سے زیادہ وقعت نہیں دیتی تھی۔

سالہا سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی عقلمندی سرزد نہیں ہو سکتی۔ خداوند کریم سے بھی جتنی رقت انگیز دعائیں کیں سبھی رائیگاں گئیں۔ دراصل میری پرابلم قدرے آرٹسٹک تھی کہ زوج کا

ذائقہ بدلنے کے لئے ماحول میں کبھی کوئی تبدیلی ضرور آنی چاہیئے۔ بیوی کا ہجر بھی ایک طرح کی تبدیلی تھی۔ سُنا ہے، اس کا ذائقہ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ میری پہلی اور آخری بیوی تھی بلکہ اس کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے میں اسے اکلوتی بیوی بھی کہہ دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی نامناسب تھی کہ جب بھی شام کو گھر لوٹتا تو گھر میں وہی پُرانی، جانی پہچانی بیوی ملتی تھی۔ صرف بیوی ہی نہیں۔ کچن میں کیتلی بھی وہی ملتی تھی۔ جسے وہ جہیز میں لائی تھی۔ ایک دن بور ہو کر میں نے بیوی کا بدلہ کیتلی سے لینا چاہا اور کہا "اب اسے ریٹائر کر دو، بوڑھی ہو گئی ہے!"

وہ بولی "نہیں، میں اسے جیتے جی الگ نہ کروں گی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر ہی مجھے ماں کی شیریں یاد آجاتی ہے"

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو ہرچا نیا کہ وہ یا تو کیتلی سے محبت کرتی ہے یا ماں سے۔ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ مجھے تو صرف گھر کی نیم پلیٹ سمجھتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ گھر نیم پلیٹ کے بغیر بھی مکمل ہے۔ اس دن میں بازار سے ایک سیکنڈ ہینڈ سوئیٹر خرید کر لایا۔ اُسے دیکھتے ہی محترمہ کا پارہ گرم ہو گیا کہ میرے مشورے کے بغیر بلکہ میری منظوری کے بغیر یہ سوئیٹر کیوں لے آئے؟ بولیں۔ "میں پوچھتی ہوں، کیا یہ سوئیٹر ہے؟ کتنا گھٹیا اور کتنا مہنگا؟"

میں نے چڑ کر کہا "ہاں ہاں، میں جو لایا ہوں"

بولیں "تو کیا آپ اس گھر میں کبھی کوئی بھی کام کی چیز لائے ہیں؟"

مَیں نے کہا "نہیں لایا تھا۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اگر وہ وسیع القلب ہوتی تو اس بیج پر مسکرا دیتی لیکن الٹی گھسوانتی

لے کر پلنگ پر جا لیٹی اور کہنے لگی ۔"یہ میرے والد صاحب کی غلطی تھی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے"!

نہ جانے کیوں اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ گھر ایک بیاباں ہے، جس میں وہ ایک پھول کی طرح کھلی ہوتی ہے ——— اگر یہ پھول ایک دن کے لئے بھی آؤٹ آف اسٹیشن ہوگیا تو یہ گھر پھر بیاباں ہو جائے گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہر روز پھول کی خوشبو اور رنگ سے بھی انسان بور ہو جاتا ہے۔ اس لئے کسی دن گھر کی بیابانی سے بھی لطف اٹھایا جائے۔ بلکہ ہجر کا فائدہ اٹھا کر ایک غزل بھی لکھ لی جائے۔ لیکن آہ! میں یہ دیکھ کر قریب قریب مایوس ہوگیا کہ غزلوں کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔

لیکن اس دن یہ اعلان سن کر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے یعنی میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ سوچا، میری بیوی اتنی بُری نہیں ——ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور کہ اس مٹی سے تو غزلوں کے کئی دیوان اُگ سکتے ہیں!

ہجر کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک گتے پر ہدایت نامہ خاوند لکھ کر لٹکا دیا اور کہا کہ ہر روز صبح اٹھ کر اس کا پاٹھ کیا کرو۔ مثلاً ان میں سے ایک دو ہدائتیں یہ تھیں ——— ہر روز چوہے دان میں پیاز کا ایک ٹکڑا لٹکا دیا کرو۔ ایک پیاز سے کم از کم تین چوہوں کا شکار لازمی ہے پیاز کے اس سٹینڈرڈ کو قائم رکھا جائے اور میری واپسی پر اعداد وشمار کے ساتھ رپورٹ پیش کی جائے۔ پڑوسن مٹی تیل کا ایک لٹر ادھار لے گئی ہے۔ اُسے مزید تیل سپلائی نہ کیا جائے۔ ہمارے گھر میں اس کی چینی کی ایک

پلیٹ موجود ہے ۔ لیکن میری عدم موجودگی میں اس کے ساتھ کوئی لین دین نہ کیا جائے ـــــــ اور میری اور بڑی سیریس ہدایت یہ تھی کہ اوّل تو اپنے کسی دوست کو گھر میں مدعو نہ کیا جائے اور اگر کوئی اپنی بیوی سے نالاں ہوکر ہمارے گھر میں پناہ لینے کے لئے آ بھی جائے تو اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سگریٹ پینے سے منع کر دیا جائے کیونکہ وہ سگریٹ کی راکھ سے قالین کا بیڑا غرق کر دے گا اور اپنے ملازم کے کان میں چپکے سے کہہ گئی کہ ایسے ہر دوست کا نام، حلیہ اور ایڈریس نوٹ کر لیا کرو ۔ میں ان سے قالین کا کلیم وصول کرونگی ۔ ریل چھوٹنے سے تین سیکنڈ پہلے دھمکی دے گئیں کہ اگر کوئی ہدایت مجھے میکے میں یاد آ گئی تو ٹیلیگرام کے ذریعے بھیج دوں گی ۔

بیوی کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا ویرانی بے حد رومانٹک ہوتی ہے ۔ امن کے فرشتوں نے میری چھت پر پنکھ پھیلا دیئے اور کہا " مبارک ہو! " غسل خانے میں گھسا تو بے اختیار جی چاہا ۔ زور زور سے گانا شروع کر دوں محلے سے گزرا تو ہر عورت حسین اور دلکش نظر آئی ۔ گھر کی بلی نے آکر مودبانہ سلام کیا اور اس لہجے میں میاؤں کی جیسے کہہ رہی ہو ـــ " مالک! دودھ کہاں رکھا ہے ؟ ناچیز کو بھوک لگی ہے ۔ اجازت دیجئے تاکہ پی لوں ۔ میں جانتی ہوں کہ دسپنا چلانا آپ کے شان کے شایاں نہیں " دھوبی نے آکر گھنٹی بجائی اور جب میں نے اسے بتایا کہ بی بی جی میکے گئی ہیں تو وہ گستاخ بولا ۔ " پھر آپ سے تو کوئی کام کی بات کرنا فضول ہے " ۔ میں نے کہا " کوئی حساب کتاب کی بات ہو تو میں نمٹا سکتا ہوں " ۔ لیکن وہ بولا " آپ کی سمجھ میں نہ آئیگی " ۔

دھوبی کے اس نقطۂ نگاہ سے مجھے مشتعل ہو جانا چاہیئے تھا ۔ لیکن میں نے اس کی گستاخی کو فراخدلی سے نظرانداز کر دیا ۔ کیونکہ میں سامراج ۔

تازہ تازہ آزاد ہوا تھا اور آزاد انسان بہت فراخدل ہوتا ہے۔ میں آزادی کی فضا میں کھل کر سانس لینا چاہتا تھا۔ کسی سے تنازعہ کرکے اپنے موڈ کو مکدر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ دیا اب میرا لنچ اور ڈنر باہر ہی رہیگا۔ لیکن اس کے باوجود تمہاری تنخواہ میں کٹوتی نہ ہوگی کیونکہ میں بی بی جی کی طرح مہاجنی ذہنیت نہیں رکھتا۔ کئی برس بعد پہلی بار ہوٹل کے کھانے میں وہی لطف آیا جو کنوارپنے میں کسی حسینہ کو کنڈ مارنے سے آتا ہے۔ آہ! میں کنوارپنے سے کتنا محروم ہوگیا تھا! احباب کو بے تکلف دعوت دی کہ آؤ تاش کھیلو، چوسر کھیلو، سگریٹیں پھونکو، بستر دل پر شکنیں ڈالو، بلکہ ایک آدھ پلنگ کا پایہ بھی توڑ سکتے ہو! چائے کے کپ پر کپ لنڈھاؤ، کسی رولز اینڈ ریگولیشنز کے بغیر بے محابا، شکم سیر سروس کی جائے گی۔ رات کو بہت لیٹ آنے میں ایک سرور آنے لگا۔ چیونٹیوں نے گھر کے دانے دُنکے پر مسلسل حملے شروع کردیئے۔ لیکن انہیں ڈسٹرب نہیں کیا گیا۔ چڑیاں میرے گھر کو اپنا آبائی دلیش سمجھ کر گھونسلے پر گھونسلے بنانے لگیں اور سارے کمروں میں خس و خاشاک بکھیر دیئے۔ لیکن میں نے ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ایک چڑیا بار بار چڑے سے بلبلا کر لاتی رہی۔ لیکن پھر وہی ذاتی معاملہ ــــــ چوہے تک میری فراخدلی سے شیر ہوگئے۔ وہ چوہے دان کو اپنے دانت دکھا کر یوں چلے جاتے جیسے کہہ رہے ہوں "سیاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا!" البتہ ایک فرق ضرور پڑا کہ بیوی کے چلے جانے کی خبر سن کر کوؤں نے آنا بند کردیا۔ کیونکہ ان کا راشن ڈپو ہی اٹھ گیا تھا۔

تین چار دن اس آزادی بلکہ آزادہ روی میں ہنسی خوشی، پلک جھپکتے گزر گئے تو پانچویں دن اچانک خیال آیا کہ ہجر کی لذت تو اٹھائی نہیں۔ ہجر

اللوں تللوں میں ہی گزر گیا اور محترمہ پرسوں لوٹ بھی آئیں گی اور آتے ہی پوچھیں گی ——— "کہاں لکھی ہے وہ غزل ؟ اور لکھی بھی ہے یا ایک قیمتی ہفتہ ضائع کر دیا ؟" لیکن شادی کے بعد میں نے شاعری کو جلاوطن کر دیا تھا۔ اس لئے بیوی کے نام ایک ہجریہ خط لکھنا ہی مناسب سمجھا اور خط لکھنے بیٹھ گیا :

اے جانِ بہار و خزاں !

جب سے تم گئی ہو، کوئلوں نے تمہارے فراق میں کائیں کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بادل صرف گرج گرج کر رہ جاتے ہیں، برستے نہیں ۔ نہ جانے انھیں کیا غم ہے۔ چاندنی چٹکتی ہے تو دھاڑیں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ کل تان پورے کے تاروں کو چھیڑا تو وہ جیسے کرلا کرلا کر کہنے لگے "لوٹ کے آ، لوٹ کے آ جا میرے میت!" اور پیاری ! سب سے بڑا ظلم تو یہ ہوا ہے کہ بینگن مہنگے ہو گئے، راشن ڈپو پر گھٹیا آٹا ملنے لگا۔ غرض تمہارے بغیر کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہی۔ یہاں تک کہ کل الماری میں تمہارا گھنگروں کا ڈبہ دیکھا وہ بھی غائب تھا ! چور لے گئے یا تم اپنے ساتھ لے گئیں ۔ جب تک تم لوٹ کر نہیں آتیں، میں تھانے میں گھنگروں کی رپٹ بھی نہیں لکھا سکتا، اس لئے آ جاؤ۔ آ جاؤ، میری خاطر نہ سہی، گھنگروں کے ڈبے کی خاطر ہی آ جاؤ !"

یہ ہجریہ خط لکھ کر لفافے میں بند کیا اور بیوی کا ایڈریس لکھا ہی تھا کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بیوی اندر داخل ہوئی ۔ بولی "کیا لکھ رہے ہو ؟" میں نے کہا ۔ کچھ نہیں، ایک بے معنی سا خط ہے ۔ لیکن تم اتنی جلدی کیوں واپس آ گئیں ؟ بولی ۔ کل رات میں نے سپنا دیکھا کہ آپ کو مچھر کاٹ رہے ہیں ۔ اپنے سر پر دوہتڑ مار کر کہا "ہائے ! میں بھی کتنی نالائق بیوی ہوں مچھر دانی تو سٹور میں بند کر کے رکھ آئی ہوں ۔ لہذا سوچا، چلوں، انھیں مچھر دانی

تو نکال کر دے آؤں !"

ہجر کا اینٹی کلائمکس

مجبور بیوی کے اس غیر ضروری وصال پر سارا پانسہ ہی پلٹ گیا اور محترمہ نے ایک ہی دن میں اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ ہجر کی ساری سرگرمیاں پس منظر میں چلی گئیں اور میں " سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے " بن کر رہ گیا کہ اچانک دوسری صبح کو پوسٹ مین عزت نامہ بر نے مجھے ایک لیٹر لا کر دیا۔ یہ خط بیوی نے میکے سے شام کو پوسٹ کیا تھا اور اسی رات کو مچھردانی کا خواب دیکھ کر صبح گاڑی پر سوار ہو کر گھر لوٹ آئی تھیں یعنی جنونِ محبت میں کیفیت کچھ ایسی ہو گئی کہ خط بعد میں پہنچا، محبوبہ پہلے پہنچ گئی! میرے منہ سے بے اختیار (بیوی کی حمایت میں) غالبؔ کا یہ شعر نکل گیا ؎

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ خط نہیں تھا، ہجر کا اینٹی کلائمکس تھا۔

اور اس میں لکھا تھا :۔۔۔۔۔

" بڑے پپو، چھوٹے پپو، منّی نمبر ایک اور منّی نمبر دو کے ابا جی!

میں یہاں بچوں سمیت خوش ہوں۔ امید ہے کہ آپ بغیر بچوں کے خوش ہونگے۔ بچے ہر روز آپ کو یاد کرتے ہیں۔ بچے ہیں نا ؟ سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ انہیں لاکھ سمجھاتی ہوں کہ اگر تمہارے ابا کو تمہاری یاد ستائے گی تو بھاگے آئیں گے، لیکن وہ پہلے ہی میری کوئی بات نہیں مانتے تھے، اب کیا مانیں گے۔ دراصل آپ ہی نے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ جب میں انھیں لے کر گھر لوٹوں گی تو ان ضدی بچوں کی

پٹائی ضرور کیجئے گا، تاکہ انہیں سبق آجائے۔

باقی یہاں پر خیریت ہے۔ آپ کی خیریت کی چنتا رہتی ہے کہ نہ جانے آپ نے میرے بغیر گھر کا کیا حال بنا رکھا ہوگا۔ پانی کا نل کبھی کھلا مت چھوڑیئے گا بستر پر سگریٹ کی راکھ جھاڑنے سے پرہیز کیجئے گا۔ میں پلنگ کے ساتھ والی تپائی پر ایش ٹرے رکھ آئی تھی۔ کپڑے میلے ہو جائیں تو انہیں فرش پر ادھر اُدھر کونوں کھدروں میں مت پھینک دیجئے گا کہیں)۔ اس طرح چوہوں کو کپڑے کترنے کا گولڈن چانس مل جاتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر شک ہوتا ہے کہ وہ لمبی ناک والی پڑوسن میری عدم موجودگی سے شہ پاکر اپنے چوہے ہمارے گھر کی طرف ہانک دے گی۔ آپ کو اپنے گھر کے اور پڑوسن کے چوہوں کی پہچان رکھنی چاہیئے۔

اور ابھی بانون کے خدشہ سے میکے میں میرا جی نہیں لگتا۔ ہر لمحہ جی چاہتا ہے پَر لگا کر اڑ جاؤں اور آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں نیپال سے سمگلنگ کی ساڑیاں آئی ہوئی ہیں سستی بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ میں نے ایک ساڑی خریدلی ہے۔ اجازت نامہ بھیج دیجئے اور ہاں! آپ کے لئے سمگلنگ کا ایک اونی سوٹ خرید لیا ہے۔ شادی کی سالگرہ پر آپ کو پیش کروں گی لیکن سلوائی گی جینیجہ اینڈ کمپنی سے ———— آپ کے پرانے ٹیلر ماسٹر نمبر بجا اینڈ کمپنی سے نہیں۔ وہ تو لٹیرے ہیں!

اور کیا لکھوں؟ آپ گھر کے حالات لکھیں تو میں بھی ان کی روشنی میں آپ کو کچھ مزید لکھ سکوں۔ چھوٹی منی کے ننھے منے انگوٹھے کا عکس اس خط پر بھیج رہی ہوں اسے چوم لینا۔ میں نے چوم لیا ہے فکر نہ کریں!

آپ کی: ————

بڑے پپو۔ چھوٹے پپو، منی نمبر ایک اور منی نمبر دو کی ماں ————

(دستخط اصل میں)

خدا کی جنّت

اور پھر یُوں ہوا کہ میں جنّت کے دروازے پر پہنچ گیا ۔
نہ جانے وہ کون تھا (ضرور کوئی فرشتہ ہی ہوگا) جس نے مجھے چھنگلی پر اُٹھالیا اور جیسے ہزاروں میل کا سفر ایک ثانئے میں طے کرکے مجھے یہاں چھوڑ گیا۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکا۔
دروازے کے باہر خاکی وردی پہنے، ایک مریل سا فرشتہ اسٹول پر بیٹھا سات نمبر کی بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اپنا شبہ دُور کرنے کے لئے اُس سے پُوچھا ـــــــ "جناب عالی! جہاں میں کھڑا ہوں ۔ کیا یہ جنّت کا دروازہ ہے؟"
چپراسی فرشتے نے میری طرف دو دُونی چار قسم کی نگاہ سے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو، اگر میں بتا دوں تو تم اس اطلاع کے کتنے پیسے دو گے؟ ـــــــ
لیکن میری پھٹیچر حالت دیکھ کر وہ شاید مایوس ہوگیا اور جیسے وہ کوئی ذمے داری

لینے کو تیار نہ ہو، کہنے لگا ۔ "کون ہو تم ؟"

"فکر تونسوی ہوں، کیا تم مجھے نہیں جانتے، ادبی رسائل نہیں پڑھا کرتے ؟"

ادبی رسائل اور فکر تونسوی شاید اس کے لئے نا قابل فہم چیزیں تھیں۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے جیسے اس نے "شٹ اپ" کہا اور بولا "ادب شدب کو چھوڑو، کام کیا کرتے ہو ؟"

"پہلے شاعری کرتا تھا، اب ......"

اسے جیسے کلیو (CLEWE) ہاتھ آگیا، جھٹ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "شاعر ہو ؟ تو پھر یہاں کیوں آگئے، یہاں سے بال برابر فاصلے پر جہنم ہے۔ سبھی شاعر وہاں جاتے ہیں"

میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا "قبلہ! مگر میں شاعری چھوڑ چکا ہوں اس لئے جنت ...."

اسے میرے ترک شاعری نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا ۔ بولا ۔ "تمہارا کیس کچھ مشکوک ہے۔ ترک شاعری کے علاوہ کوئی اور کوالٹی ؟"

"ایک تشنہ لب بھکاری کو اپنا آخری سگریٹ دے دیا تھا۔ حالانکہ میں اسے خود پینا چاہتا تھا"

اس نے ایک اور بیڑی نکال کر سلگائی (مجھے آفر نہیں کی) اور اس سے پہلے کہ کوئی اور احمقانہ سوال کرتا کھٹاک سے جنت کے پٹ کھلے اور اندر سے جیسے ہزاروں لاکھوں فرشتے ایک دم پکار اٹھے ۔ ع

اب آبھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

اور دوسرے لمحے میں جنت کے اندر تھا۔

حیرت ہوئی کہ خدا کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنت عطا کر دیتا ہے۔ بھکاری کو سگریٹ دے دو، ننگے کو لنگوٹ پہنا دو، اندھے کو سڑک پار کرا دو۔ تو پھر لوگ جنت کے حصول کے لئے بڑے بڑے مندر، سرائیں اور دھرم شالے کیوں بناتے ہیں؟ شاید خدا کو دھوکا دیتے ہیں، شاید خدا سے دھوکا کھاتے ہیں ——

جنت میں قدم رکھتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہاں میری دادی اماں ضرور موجود ہوں گی کیوں کہ جب اُس کا جنازہ اٹھا تھا تو سارے محلے نے دعا مانگی تھی کہ اے خدا! مرحومہ کو جنت میں جگہ دینا —— اور کہتے ہیں، خدا رائے عامہ کا بہت احترام کرتا ہے!

میرے دائیں پہلو میں دودھ کی ایک نہر بہہ رہی تھی اور ایک شخص جس کی مونچھیں کسی شہوت انگیز بلے کی سی تھیں، اس نہر میں پانی کے گڑوے ڈال رہا تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور پوچھا" بھائی صاحب! کیا آپ نے اس جنت میں میری دادی پربھادیوی کو دیکھا ہے؟"

اور جیسے نو واردسے سبھی مذاق کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ بولا "کونسی پربھادیوی؟ یہاں تو ہر تیسری عورت کا نام پربھادیوی ہے"!

میں نے دادی کا حلیہ بیان کیا اور کہا: "مرحومہ کے پاس دُنیا میں ایک گائے تھی، جس کا دودھ بیچ کر وہ گذر بسر کرتی تھی"!

"کیا دودھ میں پانی بھی ملاتی تھی؟"

"اُوں ہوں! وہ ایمان اور عزت سے روزی کماتی تھی!"

شخص مذکور نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا ۔" ایمان اور عزت ؟ تو تو تو، تو پھر جنت میں اس کا کیا کام ؟ ہاں برزبر فاصلے پر جہنم ہے، وہاں جاکر معلوم کرو"

اور یہ کہہ کر اس جنت مکانی نے دوبارہ سے ہانک لگائی ۔" دودھ لے لو، دودھ، گائے کا خالص دودھ ۔ جنت میں ٹیسٹ کیا ہوا"
کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے یہ شخص ۔ ملاوٹی دودھ کو بھی خالص کہے جا رہا ہے ۔اس نے میری دادی کے متعلق بھی جھوٹ بولا ہوگا ۔ وہ ضرور جنت میں ہوگی ——— میں نے اس کی ہانک سے بچنے کے لئے کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں اور تیزی سے آگے چل دیا۔

جنت کا ماحول انتہائی دلفریب اور حسین تھا ۔ ساری جنت ایر کنڈیشنڈ ہو رہی تھی ۔ دودھ اور شہد کی نہریں تو یوں عام تھیں جیسے کسی امیرزادے کی الماری میں رنگا رنگ کی نکٹائیاں لٹک رہی ہوں ۔ چاروں طرف نرم اور سرخ پھول کھلے ہوئے تھے جیسے کنواری کنواری حسینائیں، پتوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آگئی ہوں ۔ پیڑوں پر طرح طرح کے پھل، دیہاتی دوشیزاؤں کی طرح جیسے جھولا جھول رہے تھے اور نیلگوں اور سنہری پہاڑیوں کے عقب سے ایک مسحور کن، سرمدی نغمہ، برابر ابھر ابھر کر آرہا تھا۔
ماحول کے اس طلسم میں جیسے میں گھلتا جا رہا تھا ۔ اگر یہ خواب نہیں تھا تو جنت تھی اور اگر جنت نہیں تھی تو خواب تھا ۔ بہرکیف دونوں میں سے جو بھی کیفیت تھی، دلآویز اور تخیلی تھی ۔ میں نے اپنے آپ سے کہا :" بیٹا فکر تونسوی ! بڑے خوش نصیب ہو ۔ دنیا میں تم ایک سگریٹ خریدتے ہوئے گھبراتے

تھے کہ تمہارے افلاس اور سنگرتے میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہاں صرف بھکاری کو ایک سگریٹ دینے کے بدلے میں تمہیں پھلوں کے باغ مل گئے۔ جنّت میں افلاس کی نہیں، کردار کی عزت ہوتی ہے۔

لیکن جنّت میں گھومتے گھومتے مجھے ایک اچنبھا ہوا کہ یہاں کی آبادی بہت قلیل تھی۔ کہیں کہیں کوئی اکا دُکا آدمی نظر آجاتا۔ نعمتیں زیادہ تھیں۔ انسان کم تھے۔ دنیا اور جنّت میں یہ فرق تھا کہ وہاں نعمتوں کی اور یہاں انسانوں کی فیملی پلاننگ ہو چکی تھی ——— یہ صحیح ہے کہ جنّت میں صرف خوش نصیب آتے ہیں اور خوش نصیبوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے لیکن میں نے سوچا اگر یہاں چند بدنصیبوں کو بھی بلا لیا جاتا تو ذرا رونق رہتی۔ ورنہ سنسان جنّت میں کوئی کب تک رہ سکتا ہے؟

گھومتے گھومتے ایک شجر سایہ دار کے قریب رُک گیا۔ جس کے نیچے ایک حسین و جمیل سڈول بدن کی ننگی عورت کھڑی تھی اور ایک بھونڈا سا آدمی اس حسین بدن کو اپنی زبان سے چاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی صاحب! کیا ...."

بھائی صاحب نے جیسے سہم کر کہا "یہ حُور میری ہے، تمہاری نہیں ہے"

"مگر تم اِنسے چاٹ کیوں رہے ہو؟"

"اس کے بدن سے شہد کی طرح شیریں رس ٹپکتا ہے اس شہد کو چاٹنے سے ہی جنّت کا مزہ آجاتا ہے۔ کیا تمہیں ابھی تک کوئی حُور الاٹ نہیں کی گئی؟"

میں نے کہا "نہیں، ابھی خدا سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تم یہاں کب سے آئے ہوئے ہو، تمہارا اسمِ شریف؟"

"میں وصوی حل ہوں ...."

"وہی، جس کی ربڑ فیکٹری تھی اور جہاں نوجوان کنواریاں تین تین روپے روزانہ پر مزدوری کرتی تھیں"۔

"ہاں، اور یہی میری خدمت خلق تھی۔ میں ان غریب کنواریوں کو روزگار دلاتا تھا اور ان کے کنوارے بدن چاٹا کرتا تھا"۔

"ذلیل!" میرے حلق میں یہ لفظ اٹک گیا اور سوچا، یہ عورت بھی حور نہیں ہوگی، اسی ربڑ فیکٹری کی ملازمہ ہوگی۔ جسے خدا نے جنت میں بلالیا ہوگا تاکہ بدن چٹوانے کے کام آسکے! خدا کو جنت کے لئے بھی دُنیا سے ہی ہی حوریں امپورٹ کرنا پڑتی ہیں ——— میں نے دل پر جبر کرکے شخص مذکور سے پوچھا۔

"خدائے ذوالجلال کا دفتر کہاں ہے؟ جہاں میں اپنی آمد کی رپٹ کرسکوں"۔

"میں نہیں جانتا"۔ وہ شخص رُکھائی سے بولا۔

ننگی حسینہ نے شاید کچھ بتانے کے لئے اپنا منہ کھولا۔ لیکن اس شخص نے جھٹ اپنا منہ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور شہد چاٹنے لگا۔ شہد ٹپکاتے ہونٹ سرد آہ بھر کر رہ گئے۔

جنت کے نظارے دیکھ دیکھ کر کبھی یقین آتا یہی جنت ہے کبھی شک ہوتا یہ جہنم ہے، یقین اور عدم یقین کی اس کیفیت نے مجھے نڈھال کر دیا۔ —— ایک حور ایک تالاب میں نہاتے ہوئے کنارے پر کھڑے ایک بھینسے کو جلترنگ سُنا رہی تھی۔ ایک درخت پہ بہت سے کرنسی نوٹ اُگے ہوئے تھے جنہیں کچھ آدمی توڑتے اور حلق میں نگل جاتے۔ ایک چھوٹی سی سرسبز پہاڑی پہ ایک سُرخ و سپید بچہ بیٹھا تھا وہسکی کے ایک ٹب میں کھجوریں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا اور ساق

کی گٹھلیاں نیچے پھینک رہا تھا ۔ نیچے اپنے منہ کھولے کچھ ناتواں اور لاغر بچے کھڑے تھے ۔ جب بھی کوئی گٹھلی کسی بچے کے منہ میں آگرتی ' وہ نعرہ لگاتا ـــــ
" انقلاب زندہ باد !" ـــــــ اور باقی بچے نہایت نحیف آواز میں بولتے
"ہمارے لئے بھی کچھ انقلاب زندہ باد !"
میں نے ایک ناتواں بچے سے پوچھا " برخوردار ! جنت میں آکر بھی گٹھلیاں کھا رہے ہو ' اور چنبل کھجور کیوں نہیں کھاتے ؟"
وہ بچہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا اور ایک دوسرے بچے سے بولا " ذرا سننا ' یہ آدمی کیا کہتا ہے ' اس کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی "
" کوئی مشرک ہوگا " دوسرا بچہ بولا ۔
" جنت کی بولی نہیں جانتا " تیسرا بچہ کہنے لگا ۔
" تو پھر جنت میں کیسے آگیا ؟ " چوتھے نے فرمایا ۔
اور پھر سبھی بچے ایک ساتھ مجھ پر ہنسنے لگے ۔
ہاں ' میں کیسے آگیا ؟ کیسے ؟ ـــــــ معصوم بچوں کا یہ سوال ایک گٹھلی بن کر میرے حلق میں پھنس گیا اور میں ڈر گیا ۔ مجھے سچ مچ جنت کی زبان سیکھنی چاہیئے ۔ اگر مجھے جنت میں رہنا ہے تو مجھے جنت کی سی آنکھیں چاہئیں ' جنت کے سے کان ' جنت کی سی سوچ ـــــــ جنت میں آکر اصلی فکر تونسوی کو مر جانا ہوگا اور جنت مکانی فکر تونسوی کو زندہ کرنا ہوگا ۔
پریشانی اور سراسیمگی میں ' ایک دم میری چیخ نکل گئی " اے خدا ! اے خدا ! تو کہاں ہے ؟"
اور جواب میں جنت کے ہزاروں پیڑ ' لاکھوں پھل ' ان گنت پہاڑ کہہ اُٹھے " اے خدا ! اے خدا ! تو کہاں ہے ؟"

اور پھر وہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ "بڑے بھینسے ہو فکر تونسوی! یہ جنّت ہے یا گنبد! یہاں تو ہر چیخ کا ترجمہ چیخ میں کیا جاتا ہے۔ ہر فریاد کا مذاق فریاد میں اڑایا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا چاہیئے۔ تم یہاں رہنے کے اہل نہیں ہو۔

میں گھبراہٹ میں ایک طرف کو بھاگا لیکن ایک عجیب نظارے نے پھر میرے پاؤں روک لئے ———— پھولوں کے ایک نرم و نازک بستر پر ایک بوڑھا آدمی دراز تھا۔ اس کے چاروں طرف انواع و اقسام کے کھانے اور پھلوں کا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ جنہیں کتے اور گیدڑ اور چوہے نوش فرما رہے تھے۔ مجھے گھن آ گئی۔ لیکن گھن کے باوجود جستجو مجھے اس بوڑھے کے پاس لے گئی اور میں نے کہا: "السلام علیکم!"

اسے کے اسے گھن آ گئی، منہ پھیر کر بولا: "میں اسلام کا دشمن ہوں، اس لئے گڈ ایوننگ کہو!"

میں نے فوراً اپنی مذہبی اصلاح کر ڈالی اور انگریزی میں پوچھا: "ویل! آپ خود یہ کھانا کیوں تناول نہیں فرماتے؟"

"میں جانوروں سے پیار کرتا ہوں!"

"انسانوں سے نہیں کرتے؟"

شاید وہ خوش نہیں ہوا، اس نے ایک کتے کی طرف اشارہ کیا اور اشارہ پاکر وفادار کتا مجھ پر بھونکنے لگا۔ کتّے سے شہ پاکر ایک چوہے نے میرے پاؤں پر کاٹ کھایا اور اس سے پہلے کہ کوئی گیدڑ مجھ پر حملہ کرتا ـــ میں بگٹٹ بھاگ گیا اور جانوروں کے قہقہے دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔ یہ قہقہے مجھے مانوس معلوم ہوئے۔ دنیا میں ایسے قہقہوں کے کئی ٹیپ ریکارڈ بھرے

جا چکے تھے اور ریڈیو اسٹیشنوں سے عام سنائے جاتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے یوں لگا جیسے ایک شفقت بھرا مہربان ہاتھ میرے کندھے پر آ پڑا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ایک حسین و جمال نورانی چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "مجھ پر اس نے کتے چھوڑ دیئے۔ اس نے مجھے غلط سمجھا۔ میرا کوئی قصور نہیں حضور!"

نورانی چہرہ مسکرایا "غلط تم سمجھے۔ یہ بڈھا اپنی دولت کو اپنے احباب اور مصاحبوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ دولت کی اس تقسیم پر خدا اس سے خوش ہو گیا اور چند روز کے لئے اُسے جنّت عطا کر دی۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیسا خدا ہے؟ جو دولت کے منصفانہ تقسیم کے اصول ہی نہیں جانتا۔" میں نے احتجاج کیا۔ جنّت میں آنے کے بعد خدا کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا۔

نورانی ہاتھ پھر میرے کندھے تھپ تھپانے لگا "فکر تونسوی صاحب! خدا کی عظیم حکمت کو سمجھو کہ اس نے بڈھے کو جنّت تو عطا کر دی مگر بھوک چھین لی۔ تم نے دیکھا نہیں نعمتوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا مگر عامۃ الناس آ کے کھا رہے تھے اور وہ خود کھانے سے محروم تھا۔ بھوک کا چھن جانا قہرِ الٰہی سے کم نہیں ہوتا۔"

مگر فرشتے کا یہ فلسفہ مجھے ہضم نہ ہو سکا۔ شاید یہ جنّت کی فلاسفی تھی۔ اس لئے میں خاموش ہو گیا اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "اے مہربان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں جنّت میں ہوں یا جہنّم میں؟"

"ابھی بتاتا ہوں!"—— یہ کہہ کر اس نے اپنی دائیں انگلی سے خلا

میں ایک گول دائرہ سا بنایا اور پھر جیسے دور، ہزاروں میلوں سے آواز آئی ۔" اس دائرے میں داخل ہو کر ہمارے پاس آجاؤ ۔"

کیا یہ خدا کی آواز تھی ؟

میں خوش ہو کر ہلکے غبارے کی طرح دائرے میں داخل ہو گیا اور پھر یوں لگا جیسے نرم و نازک ہوا کے وشال سمندر میں تیرتا جا رہا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں ؟ وہ فرشتہ کون تھا ؟ دائرہ کیا تھا؟ وہ جنت کہاں گئی ؟ کیا سچ مچ میں خدا کے حضور میں جا رہا ہوں، کیا وہ بلانے والی آواز کوئی دھوکا تو نہیں تھی ؟ میری منزل کہاں ہے ؟ جنت یا جہنم؟ یا یوں ہی صدیوں تک قرنوں تک اس سمندر میں تیرتے رہنا ۔ تیرتے رہنا ۔

اپنے ہی سوالوں کے ہجوم سے میں گھبرا گیا اور ایک کربناک چیخ میرے منہ سے نکلی :" اے خضر راہ! اے خضر راہ! میں کہاں ہوں ؟"

جواب میں میرے پاؤں کے تلوؤں سے جیسے ایک قہقہہ سا نکلا اور یہ قہقہہ نیچے اترتا چلا گیا اور قہقہے کے ساتھ ہی میں اترتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے پاؤں ریشم ایسی ملائم مٹی سے جا لگے ۔ اس نرم مٹی کے لمس سے میرا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا ۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے سامنے کھڑا ہوں ۔ جو بیر بہوٹی کی طرح لال بھبھوکا پھلوں سے لدا ہوا ہے اور اس کے نیچے ایک عورت ......

او مائی گاڈ! یہ تو وہی عورت ہے جس کے خواب جنم جنمانتر سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں بالکل وہی سراپا ۔ جس کا میں ہی خالق تھا ۔ جس کا ایک ایک انگ میں نے ہی تراشا تھا ۔ نسائی حسن کے جس روپ کو خلانے ادھورا چھوڑ دیا تھا اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا اور میں اس مکمل روپ کو تخیل کی داد دیتے

نکال کر حقیقت بنانے کے لئے صدیوں سے بھٹکتا پھرتا تھا ——— اور آج وہ مل گئی تھی، بالکل وہی، میرے سامنے، کانچ کی طرح بلوریں جنت کا لباس پہنے، میرے سامنے کھڑی تھی۔

میرا دل ایک دم اچھل کر حلق تک آگیا۔

"یہی تمہاری جنت ہے، لیٹ جاؤ" پیڑ پر سے ایک آواز آئی۔

میں نے پیڑ کے اوپر نگاہ ڈالی۔ ایک قوس قزح رنگ کا نہایت ہی خوبصورت ناگ اپنی زبان باہر نکالے مجھ سے مخاطب تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لال بھبھو کا پھل توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں خدا ہوں"

"خدا؟ ——— میرا سر غرور" خدا کے سامنے جھک گیا"۔ مگر اے خدا! تیری شکل سانپ کی سی کیوں ہے؟"

"کیونکہ میں شیطان بھی ہوں!"

"شیطان؟ ——— بڑا کنفیوژن تھا۔ یہ کیسا خدا ہے جو شیطان بھی ہے! یہ کیسا شیطان ہے جو خدا بھی ہے؟ میرا دماغ چکرانے لگا۔ جنت اور میرے درمیان صرف ایک پھل کا فاصلہ تھا۔ میں کیا کروں؟ کس کو خضر راہ بناؤں؟ ہر شے بڑی گنجلک ہو رہی تھی۔

بے تابانہ میں اس سراپا محبوبہ کی طرف بڑھا "ڈارلنگ!"

محبوبہ بھی بے تابانہ میری طرف بڑھی — "ڈیر!"

"ہم آغوشی ممنوع ہے؟ بے وقوفو!" پیڑ پر سے آواز آئی۔

اچانک لال بھبھو کا پھل زمین سے اوپر اٹھا اور ہم دونوں کے ہونٹوں

کے درمیان آکر رُک گیا۔ اب دو پیاسے ہونٹوں کے درمیان صرف یہی پھل حائل تھا۔

"اِس پھل کو کھا جاؤ!"
"اِس پھل کو مت کھاؤ!"
"اِس پھل کو کھا جاؤ!"
"اس پھل کو مت کھاؤ!"

دونوں منفی اور مثبت آوازیں مسلسل آنے لگیں۔ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، ایک دوسرے سے لڑتی ہوئی، بالکل دو متضاد جھگڑوں کی طرح، دو مہیب پہاڑوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں اور جوں جوں یہ مہیب جھگڑا تیز ہوتا گیا، میں اور میری محبوبہ مارے خوف کے ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ اور قریب اور قریب۔ اور پھر یوں لگا، جیسے ہمارے درمیان اس پھل کا فاصلہ بھی مِٹ گیا، وہ پھل بھی جیسے شیریں رس بن کر ہم دونوں کے ہونٹوں میں گھل گیا اور پھر ہونٹ مل گئے۔ لال بھبھوکا ہونٹ گرم گرم، پیاسے، پیاسے ہونٹ، اور ہم دونوں کے بدن لال بھبھوکا ہو گئے اور عجیب پُر اسرار نشیلی لہروں کے جھولے میں جھولنے لگے اور دُور سے، جیسے کسی بے بس خدا کی آواز آتی رہی۔
"یہ گناہگار ہیں، انہیں جنّت سے نکال دو!"

اور بے بس خدا کی اسی آواز میں گھل مل کر آتی ہوئی بے بس شیطان کی آواز چیختی رہی "ہاں! انھوں نے ثواب کمایا ہے، انہیں جنت سے نکال دو!——"

اور پھر خدا اور شیطان جیسے ایک دائرے میں گھومتے ہوئے ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگے اور پھر ہر شے گھومنے لگی، پیڑ، نہریں، جنت ——

اور ہزاروں لاکھوں گھنٹے ایک دم بج اُٹھے اور جھکڑ چلتا رہا اور ہم جھٹکے کھاتے رہے، پتھر، شعلے، انگارے ہمارے اردگرد بھیانک رقص کرنے لگے ــــــ لیکن ان میں سے کوئی چیز ہم دونوں کو جُدا نہ کر سکی۔ اور پھر جیسے کوئی نڈھال ہو جاتے ایسے ہی ہم ایک دھماکے کے ساتھ جیسے کروڑوں میل کی بلندی سے نیچے آ گرے ــــــ اور پھر ایک دم پیارا پیارا سکون سا چھا گیا۔

اور میں نے اپنی سہمی ہوئی آنکھیں کھول دیں اور کیا دیکھا کہ پھر جنّت کے دروازے پر کھڑا ہوں اور وہی فرشتہ اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اُس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور بولا۔ "جنّت سے ہو آئے؟ کیسی لگی ــــــ؟"

میں نے کہا۔ "اچھی ہے۔ بالکل ہماری دُنیا ایسی ــــــ عشق وہاں بھی شجرِ ممنوعہ ہے اور یہاں بھی۔"

وہ بڑے فخر سے بولا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا نا؟ جنّت اور جہنّم میں صرف بال برابر کا فرق ہوتا ہے۔"

بچے کتنے ہونے چاہئیں

کچھ عقل مند لوگ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے مگر میرا خیال ہے کہ بچوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے یا شاید یوں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بڑھ رہے ہیں یا دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ادھر گورنمنٹ اپنی ٹکسال میں سے ایک نوٹ چھاپ کر مارکیٹ میں بھیجتی ہے اور ادھر والدین بھی اپنی ٹکسال میں سے ایک بچہ چھاپ کر مارکیٹ میں ارسال کر دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کو اس بچے پر بڑا غصہ آتا ہے کہ یہ کم بخت اب کھائے گا کہاں سے؟ چنانچہ وہ اشتعال میں آکر ایک اور نوٹ چھاپ دیتی ہے اور ادھر جب ایک نوٹ چھپ جانے کی خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ جھانک کر کہتا ہے "آداب عرض ہے!"

اور یوں کرنسی اور بچوں میں یہ ریس جاری ہے اور ان دونوں کے درمیان بے چارے والدین "سینڈوچ" بنے جا رہے ہیں۔

اس ریس سے گھبرا کر کچھ اور عقلمند لوگ اُٹھتے ہیں "فیملی پلاننگ کرو، فیملی پلاننگ کرو، ورنہ مر جاؤگے!" چنانچہ عامۃ الناس ایمان داری سے سوچنے لگتے ہیں کہ بچّوں کی تعداد کو "پلان" کرنا چاہیئے اور زیادہ تعداد میں بچّے پیدا کر کے ملک کے بھاکرہ ننگل میں شگاف پیدا نہیں کرنا چاہیئے۔

مگر میرا خیال ہے کہ جو لوگ کم بچّے پیدا کرنے کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ کچھ جذباتی واقع ہوئے ہیں اور انھوں نے مسئلہ کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ کم بچّے پیدا کرنے کا تعلق صرف اقتصادیات سے نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور مصیبتیں بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً کم سے کم جتنے بچّے پیدا کئے جا سکتے ہیں وہ یہ کہ صرف ایک بچّہ پیدا کیا جائے کیونکہ ایک بچّے سے کم بچّے پیدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے، لیکن فرض کیجئے۔ اگر یہ بچّہ ناخلف نکلے تو آپ کیا کریں گے ——— یہ حقیقت ہے کہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچّہ ناخلف ضرور نکلتا ہے، اس لئے اگر بچّہ ہی ایک ہو تو ناخلف ہونے کی ذمہ داری بھی اسی کو اٹھانا پڑے گی۔ لہٰذا ناخلف بچّے کے مقابلے پر ایک فرمانبردار بچّہ ضرور پیدا کرنا چاہیئے، تاکہ بوڑھا باپ اپنے ہمسائے سے کہہ سکے " اجی راگھو رام جی وہ تو کہیئے میرا نصیب اچھا تھا کہ چھوٹا لڑکا فرماں بردار نکلا، ورنہ بڑے نے تو گھر کی ناک ہی ڈبودی تھی"۔

یعنی اب کم سے کم تعداد دو بچّے ہوگئی جو ایک بنیادی سماجی ضرورت ہے مگر یہ دونوں بچّے لڑکے ہونے چاہیئیں کیونکہ اگر ان میں سے ایک لڑکا ہو، اور ناخلف ہو اور دوسری لڑکی ہو جو بیاہی جائے تو آپ کے پلّے کیا باقی رہا؟ لہٰذا دو لڑکوں کے بعد تیسری ایک بہن بھی ہونی چاہیئے تاکہ راکھی باندھ سکے۔

بھیا کی شادی پر تلک لگا سکے۔ سسرال میں جاکر بھیا کی یاد میں گیت گا سکے۔ اس کی گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز پر دھیان دھر سکے۔ یعنی بہن ایک سخت سماجی ضرورت ہے اور یوں سماجی ضرورت کی مجبوریوں کے کارن تین بچوں کا کوٹا بنانا ہی پڑے گا۔

جب یہ تینوں بچے بڑے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ سخت زمانے کی مار کھا کر سنجیدہ بھی ہو جائیں گے اور والدین کو بور کرنے لگیں گے۔۔۔ اس سنجیدگی کی بوجھل فضا کو توڑنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ننھی منی سی، سادہ اور معصوم توتلی سی آواز گھر کے آنگن میں گونجنی چاہیئے، ورنہ ساری زندگی پھیکی ہو کر رہ جائے گی اور یوں بھی جب والدین ادھیڑ عمر سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو ایک ننھے بچے کی تمنا ضرور کرتے ہیں کیونکہ اس نازک عمر میں زمانے کے تھپیڑے کھا کھا کر والدین اتنے دکھی ہو چکتے ہیں کہ اس دکھ پر صرف ایک توتلی آواز ہی مرہم رکھ سکتی ہے۔ اگر اپنا ننھا نہیں ہوگا تو پڑوسیوں کے بچوں کو سینہ سے لگائے پھریں گے۔ مگر دوسروں کے بچے کا کیا اعتبار؟ موڈ آجائے تو آجائے نہیں تو دور سے انگوٹھا دکھا دے گا اور اونچی آواز میں رو کر کہے گا

"ممی! یہ آدمی مجھے مارتا ہے!"

امید ہے آپ قائل ہو گئے ہوں گے کہ چار بچے کم از کم تعداد ہے ــــــ جو بے حد ضروری ہے!

میں جوں جوں زیادہ سوچتا ہوں توں توں بچے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں مگر میری یہ سوچ غلط حقائق پر مبنی نہیں۔ میں نے باقاعدہ حساب کر کے دیکھا ہے کہ

آٹھ سے کم بچوں کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوتا ۔ مثلاً فرض کیجئے، آپ کے آٹھ بچے ہوں تو ان میں سے ایک لڑکا تو گھر سے ضرور بھاگ جائے گا کیونکہ تیرہ اور سترہ سال کی عمر کے درمیان ہر لڑکا گھر سے بھاگ جانے کی سوچتا ہے تاکہ اپنے پاؤں پر آپ ہی کھڑا ہو سکے ۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ ان آٹھ میں سے کونسا لڑکا بھاگ جائے گا ۔ اس لئے ریزرو اسٹاک میں سے ایک لڑکا فرار کے لئے آپ کو الگ رکھنا ہی پڑے گا ۔ لڑکے کے فرار ہونے پر پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ فراری لڑکے جب دوبارہ نمودار ہوتے ہیں تو سماج میں کوئی نہ کوئی اہم رتبہ حاصل کرکے نمودار ہوتے ہیں ۔ میں نے اکثر فراری لڑکے فلمی ہیرو، شاعر، ایڈیٹر اور فلاسفر بنتے دیکھے ہیں اور اگر یہ نہیں بنتے تو ڈاکو بن کر ابھرتے ہیں ۔ مگر ابھرتے ضرور ہیں ۔

گویا آٹھ میں سے ایک خارج ——— باقی رہ گئے سات ———

ان میں سے لڑکیوں کو تو ایک دم نکال دیجئے، کیونکہ وہ پرایا دھن ہوتی ہیں ——— بیاہی جائیں گی ——— مگر یہاں یہ احتیاط ضرور رکھ لینی چاہیئے کہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں ہی نہ ہوں ورنہ سارا دھن پرایا ہو جائے گا اور آپ کا گھر لٹ جائے گا کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین لڑکیاں ہی داماد وں کا گھر بسانے کے لئے پیدا کرنی چاہیئں ۔ میرے ایک دوست ہیں جن کی نو لڑکیاں ہیں اور ان کا گھر بالکل گرلز اسکول معلوم ہوتا ہے ۔ ایک دن میں نے ان سے کہا ———

"جناب عالی! یہ یک طرفہ ٹریفک کیوں ؟" تو وہ ایک گز لمبا سانس بھر کر بولے :" اولاد نرینہ کی خواہش میں یہ ٹریفک چل پڑا ہے اور اب رکتا ہی نہیں !"

کثرتِ اولاد کے حق میں ایک مضبوط دلیل ہے :" اولاد نرینہ" ۔ کیوں کہ لڑکیاں چاہے لاکھ بہادر ہوں مگر ہر لڑکی جھانسی کی رانی نہیں بن سکتی !

اب لگائیے حساب — ایک لڑکا بھاگ گیا، تین لڑکیاں بیاہی گئیں، باقی رہ گئے چار لڑکے۔ ان میں سے ایک لڑکا ایسا رکھیئے جسے پٹائی کی جاتی رہے کیونکہ ہر گھر میں ایک بچہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے جس پر والدین اور بڑے بھائی اپنے ہاتھ سینک سکیں۔ کیونکہ اگر پٹائی نہ کی جائے تو گھر بالکل سُونا سُونا سا لگتا ہے۔ پٹائی سے گھر میں ذرا چیخ دھاڑ رہتی ہے اور گھر آباد لگتا ہے۔

ان آٹھوں میں سے ایک بچہ ایسا ہونا چاہیئے جسے سارا گھر پیار کر سکے۔ کیونکہ ہر بچے کو پیار کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ صرف ایک ہی بچہ ایسا ہوتا ہے جو گھر کا چراغ کہلاتا ہے اور اسی سے ہی سارے کنبے کے اندھیرے وابستہ ہوتے ہیں۔ باقی بچے اگرچہ چراغ ضرور کہلاتے ہیں مگر صرف نام کے چراغ ——— کسی میں تیل نہیں ہوتا تو کسی کے بتی ہی غائب ہوتی ہے۔

یعنی اب تعداد ہو گئی چھ — باقی رہ گئے دو لڑکے جو متفرقات کے لئے ہونے چاہئیں۔ مثلاً کوئی ہنگامی ضرورت آ پڑے، جیسے ملک کی حفاظت کا سوال پیدا ہو جائے اور انہیں فوج میں بھرتی کے لئے بھیج دیا جائے، اور اگر فرماں بردار لڑکا نوکری کے لئے کہیں باہر چلا جائے تو ان دو زائد بچوں میں سے ایک کو فرمانبرداری کی ڈیوٹی پر لگا دیا جائے اور دوسرے کو پڑوسیوں کے لڑکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس سے گھر کے دوسرے کام کاج کروائے جائیں۔ جو آدمی مجھے ان آٹھ بچوں میں سے ایک کو بھی غیر ضروری ثابت کر دے۔ میں اس کا بیٹا بننے کے لئے تیار ہوں۔

———

دِلّی جو ایک شہر ہے

دہلی کا آواگون

کہتے ہیں، دہلی کئی بار اُجڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کو اجڑنے اور آباد ہونے کا پُرانا چسکا ہے۔ وہ اجڑنے کے لئے آباد ہوتی ہے اور آباد ہونے کے لئے اُجڑتی ہے۔ یعنی وہ آواگون کی تھیوری میں یقین رکھتی ہے بار بار جنم لیتی ہے، بار بار مرتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بار بار اسی گھر میں جنم لیتی ہے جہاں سے اس کی ارتھی نکل تھی وہی روح، وہی نام، وہی مقام ——
صرف یہ چولا بدل لیتی ہے بلکہ کئی بار تو چولا بھی وہی ہوتا ہے۔ صرف اُسے "ڈرائی کلین" کرا لیتی ہے، اس کا رنگ بدل دیتی ہے۔ اس پر نئے پھول اور بیل بوٹے کاڑھ لیتی ہے۔ شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یا نئے نادرشاہ کو ترغیب دینے کے لئے کہ دیکھو میں کتنی پُرکشش ہوں، آؤ اور میرے حسن کو لُوٹ لو۔ میری مانگ اُجاڑ دو، کیونکہ میں اجڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ میری بہار میری

خزاں ہی کا عکس ہے ۔ مجھے اُجاڑ دو، لوٹ لو، مار دو، کیونکہ میری موت ہی سے زندگی کا پھول کھلتا ہے ۔

دہلی ــــــ ایک بیوہ ــــــ

آج کی دہلی ایک خوشنما پھول بن کر کھلی ہوئی ہے ۔ آج سے چند سال پہلے اس کی سانس اکھڑ گئی تھی جب چند سیاست داں قسم کے غاصبوں نے تقسیم ہند کے نام پر اُس کی مانگ اجاڑ دی تھی ۔ اس کے پھول مسل ڈالے گئے، اس کی بہار لوٹ لی گئی اور پھر جب اس کا حسن نیست و نابود کر دیا گیا ۔ تو دہلی کی روح اس بربادی اور ویرانی پر چہچہا اٹھی ۔ کیونکہ تخریب ہی اُس کی روح کی غذا تھی ۔ موت ہی اس کی طمانیت تھی ۔ مسمار ہونا ہی اس کا مزاج تھا ـــــ اور پھر چند برس ہی میں دنیا نے دیکھا کہ دہلی کے ویرانے میں ایک پھول کھل اٹھا ۔ اس پھول میں ایک نئی کشش تھی، نئی خوشبو اور نیا رنگ تھا چند برس پہلے کا کوئی "جلا وطن" آج دہلی میں آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ یہ وہ خاتون تو نہیں ہے جو بیوہ ہو گئی تھی ۔

لیکن دہلی، جمنا میا کی قسم کھا کر کہے گی "میں وہی خاتون ہوں ۔ صرف رنگ روپ ذرا نکھر آیا ہے کیونکہ وٹامن سی کا استعمال ذرا زیادہ کرنے لگی ہوں" ۔

مگر اے رُوپ متی ! ڈرتا ہوں، کہیں تجھے پھر نظر نہ لگ جائے" ۔

"چشم ما روشن دلِ ما شاد"

دہلی ــــــ ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ ــــــ

آج کی دہلی ایک ایسی اٹھارہ سالہ دوشیزہ کی طرح ہے جس پر جوانی ٹوٹ

ٹوٹ کر آتی ہے۔ اس سے آنکھ ملانے کے لئے سورج دیوتا کی سی آنکھ چاہیئے اور مہرشی وشوامتر کا سا تقدس، ورنہ ایمان بھرشٹ ہونے میں ایک سیکنڈ نہیں لگتا۔ ایک بار جو دہلی آگیا وہ اس کی زلف کے جال سے نکل نہ سکا اور جو ابھی تک دہلی نہیں آیا وہ دُور بیٹھا اس کے فراق میں آہیں بھر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ ایک آہ ایسی لمبی بھرے کہ خود بخود کھنچ کر دہلی تک آجائے اور دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر یہ پُوچھے "کیوں صاحب! کیا دہلی یہی ہے؟" اور اسے جواب ملے "معاف کیجئے، مجھے فرصت نہیں، کسی اور سے پُوچھ لیجئے!"

کسان سے سمگلر تک ——————•

اگر آپ ابھی تک دہلی نہیں آئے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے جلد ہی آجائیں گے۔ کیونکہ دہلی آنے کے کئی بہانے ہیں۔ آپ کسی کسان ڈیلی گیشن میں شامل ہو کر آجائیں گے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے اگر مظاہرہ کریں جس کے ارد گرد عام طور پر دفعہ ۱۴۴ لگی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کی کوٹھی کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آجائیں گے، گاؤں میں بھوکوں مر مر کر دہلی میں نوکری کرنے کے لئے آجائیں گے۔ بھیک مانگنے کے لئے آجائیں گے کیونکہ یہاں کے گناہ گار بیوپاریوں کے کشکول میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر ثواب کمانے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آجائیں گے جہاں پانچ روپے فی کپ چائے ملتی ہے اور جہاں کے بیرے مغل شہزادے معلوم ہوتے ہیں —— اور اگر کوئی بہانہ نہ ملے گا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کر کے دہلی لے آئیں گے۔ گھڑیاں، سونا، کپڑے، لڑکیاں، عورتیں، کیونکہ دہلی سمگلروں کا

کی بہت بڑی چھیتی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز بغیر رسید پرچہ کے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانے سے آئیں گے، جلد یا بدیر دہلی ضرور آئیں گے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کریں گے اور پھر لکھ پتی ہو جائیں گے یا صرف پتی دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی ——————.

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں پھیل جاتے ہیں کہ وہ بھی دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک "پہاڑی چھوکرا" جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے۔ آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے یا آج صبح ہی لاریوں کے اڈے پر اترا ہے۔ یا کالی باڈی میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی منڈلیمن سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے، سیاہ رنگ کی کار ڈرائیو کر رہا ہے۔ سنٹرل سیکرٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلرکی کر رہا ہے یا آج ہی مدراس میل پر سوار ہو کر دہلی میں کلرکی کرنے آیا ہے ——— اور یا اجمیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہوئے ہیں وہ ۱۹۴۷ء ہی میں یہاں تانگہ ہانکنے آ گیا تھا یا سہارنپور میں اس کا چینی کا ڈپو تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟

اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان، جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوتی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اچکن اور پائجامے کے اوپر ہیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے مچھلی چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے پراٹھا اور چھاچھ نوش فرمائی ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کے باشندے کہتے ہیں۔

غرض دہلی میں ہر شخص دہلی کا باشندہ ہے اور ہر شخص اجنبی ہے ——— ہر باشندہ ایک دوسرے کے لئے انجان! لیکن ہر اجنبی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتا ہے کیونکہ دہلی کا کلچر اجنبی ہے، لباس اور زبان اجنبی ہے۔ دہلی کے پچیس میل کے گھیرے میں یہی اجنبیت پھیلی ہوئی ہے۔ اجنبیت ہی دہلی کا کلچر ہے، لباس اور زبان ہے اور یہ کلچر، لباس اور زبان دہلی میں آنے والے ہر طرف سے ہر روز داخل ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی نے اپنا کلچر کھو دیا ہے۔ اور اجنبیت باقی ہے۔

حدود اربعہ کہاں گیا؟

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی فارمولا دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر،

جن سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ دہلی میں دریا بھی ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی۔ لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان بندشوں کی پروا نہیں کی اور تیز رفتار سیلاب کی طرح ان کے اوپر سے دندناتی ہوئی گذر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر آ گئی ہیں، یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے قید کر لیا ہے۔ مثلاً بچاری جمنا دہلی شہر کے اندر یوں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھیرے میں کوئی سہما ہوا مجرم۔ دہلی کے کئی پہاڑ جو کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں، لاریاں اور سائیکلیں گذار کر یوں لے جاتے ہیں جیسے یہ پہاڑ نہ ہوں بلکہ ان کے زر خرید غلام ہوں۔ سارے پہاڑ دہلی کے چھوٹے چھوٹے محلے بن گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنج، پہاڑی دھیرج، بھوجلہ پہاڑی۔ آنند پربت رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے "پہاڑی چھوکرے" معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے دہلی میں آ گئے ہیں۔

دراصل جب سے دہلی آزاد ہندوستان کا دارالخلافہ بنی ہے آزاد اور بے باک ہو گئی ہے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود متعین کرنا قریب قریب ناممکن ہے — ہر سال نہیں بلکہ ہر ہفتے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پٹیل نگر نامی کالونی میں تھی تو ہفتے کے ختم ہونے سے ایک گھنٹے پہلے پتہ چلتا ہے کہ اب پٹیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جمنا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی اور اب شاہدرہ والے سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم

مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہان بس گیا ہے۔ غرض دہلی کی حدیں ٹوٹتی بنتی اور بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں شیطان آ گھسا ہے جو اپنی آنتوں کو چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی ایک حد کلکتہ ہے۔ اور دوسری حد سری نگر۔ ممکن ہے، نقشے سے ہندوستان نام کا ملک غائب ہو جائے اور دہلی نام کا ملک نمودار ہو جائے کیونکہ ہندوستان سمٹ رہا ہے اور دہلی بڑھ رہی ہے۔ دہلی ایک جسم ہے جس میں ہندوستان کی روح داخل ہوتی جا رہی ہے۔ جسم اور روح کا یہ وصال ٹریجڈی ہے یا کامیڈی۔ اس کا فیصلہ ہم آنے والے مورخ پر چھوڑتے ہیں۔

ایک نہیں پانچ دہلیاں ————•

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دہلی صرف ایک ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہئے کیونکہ "دہلیاں" پانچ ہیں۔ پرانی دہلی، نئی دہلی، شرنارتھی دہلی، چھاؤنی دہلی، دیہاتی دہلی اور ان میں سے ہر دہلی دوسری دہلی سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ ہر دہلی دوسری دہلی کی سوکن معلوم ہوتی ہے۔ پرانی دہلی اپنے آپ کو خاندان کی اس بڑی بی کی طرح سمجھتی ہے جس کی کمر میں چابیوں کا گچھا لٹکتا رہتا ہے اور جو اپنے سامنے خاندان کے سارے افراد کو ہیچ سمجھتی ہے۔ اور منہ میں پان کی گلوری دبائے "پدرم سلطان بود" کے نعرے لگاتی رہتی ہے —— اور نئی دہلی خاندان کی وہ ماڈرن لڑکی ہے جو چابیوں کے گچھے کی بجائے کلائی میں پرس جھلاتی ہوئی اپنے آپ کو "یورپ رٹرن" کہتی ہے۔ منہ میں "چیونگ گم" دبائے اپنے آپ کو انڈیا کی "ہر ہائینس" سمجھتی ہے اور پرانی دہلی سے الگ کر آئی

ہوئی کسی مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتی ------ اور "شرنارتھی دہلی" اپنے آپ کو وہ طرار حسینہ سمجھتی ہے جو اپنی عشوہ طرازیوں کے ساتھ یہاں آئی اور دلِ عشاق پر حملہ کر کے فاتح بن گئی۔ کبھی منہ میں پان دبا لیتی ہے، کبھی چونگ گم اور کبھی گنڈیریاں۔ اپنے آپ کو دہلی کی ناک سمجھتی ہے۔ مگر سرکار اس پر ہمیشہ گھاس نہیں ڈالتی رہتی ہے۔ چھاؤنی دہلی کی پوزیشن اس جلاوطن ملکہ کی سی ہے جو اب بھی اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث سمجھتی ہے اور اپنی رعایا سے دور ہی رہنے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے اور دیہاتی دہلی اس بے بس دوشیزہ کی طرح ہے جس کا بیاہ زبردستی ایک ایسے شخص سے کر دیا گیا ہو جس کے نام کا وہ صحیح تلفظ بھی نہیں جانتی۔ لیکن گھونگھٹ اوڑھے "پتی ورتا دھرم" نبھاتے چلی جا رہی ہو۔

ان پانچوں دہلیوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم حاکم ہیں۔ ہمارے ہی احکام کے سامنے سارا ہندوستان سر جھکاتا ہے۔ ہم اس دہلی کے مالک ہیں جو ہمالیہ سے راس کماری تک راج کرتی ہے۔ دہلی کا ہر باشندہ اپنے آپ کو راجکمار محسوس کرتا ہے۔ اپنی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چاہے اسے آسٹریلیا کا گندم ہی کھانے کو ملے۔

دہلی کی بسیں ———•

دہلی شہر کے اندر ڈی۔ ٹی۔ سی بسیں چلتی ہیں جو انسانوں کو ڈھونے کا کام کرتی ہیں۔ ایک علاقہ کے لوگوں کو اٹھا کر دوسرے علاقہ میں پھینک آتی ہیں اور دوسرے علاقہ کے لوگوں کو تیسرے علاقہ میں۔ دہلی کا ایک انسان اگر دوسرے انسان سے جڑا ہوا ہے تو ان بسوں کی بدولت۔ اگر ایک دن کے لئے یہ بس سروس ختم ہو جائے تو محبوبہ اپنے عاشق سے نہیں مل سکتی۔

طالب علم اپنے ٹیچر سے نہیں مل سکتا، قرضخواہ اپنے مقروض تک نہیں پہنچ سکتا۔ مالک اپنے ملازم کے ہجر میں تڑپتا رہے اور کلرک اپنے افسر کی جھڑکیاں کھانے سے محروم رہ جائے۔ حتیٰ کہ آتما اپنے پرماتما سے نہیں مل سکتی، جب تک بس ڈھوکر اسے پرماتما تک نہ پہنچا دے۔

غرض یہ بسیں دہلی کے بچھڑے ہوؤں کا "وصال" کراتی ہیں۔ دراصل دہلی بہت سے "ہجر زدہ" ٹکڑوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اگر یہ ٹکڑے ہمیشہ الگ تھلگ رہیں تو دہلی نام کا شہر ہندوستان کے نقشہ پر نظر نہ آئے۔ دہلی کو ایک وحدت، ایک اکائی، ایک شہر کی حیثیت اسی وقت ملتی ہے، جب ڈی۔ ٹی۔ سی بسیں ان ہجر زدہ ٹکڑوں کا ایک دوسرے سے وصال کراتی ہیں ــــــــــ اس اعتبار سے دہلی کی بسیں ایک ایسے "ایجنٹ" کی طرح ہیں جو طالب و مطلوب کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے اور اپنی "دلالی" کھری کرتا ہے۔

لیکن یہ بسیں صرف ایجنٹ ہی نہیں ہیں۔ صرف اپنی "دلالی" ہی کھری نہیں کرتیں۔ صرف عاشق کو محبوبہ ہی سے نہیں ملاتیں بلکہ خود بھی محبوباؤں کی کی طرح ناز نخرے دکھاتی ہیں۔ محبوبہ کے دیدار سے پہلے آپ کو بس کے دیدار کے لئے تڑپنا پڑتا ہے۔ بس ایک طرح کی لیلیٰ ہے جس کے مجنوں اس کے انتظار میں سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں۔ ایک مجنوں نے تو مجھے یہاں تک بتایا کہ وہ دہلی کے ایک بس شاپ ہی پر پیدا ہوا تھا۔ یہیں پر ماں کا دودھ پی پی کر بڑا ہوا۔ یہیں پر مونگ پھلیاں کھا کھا کر جوان ہوا۔ بس کے انتظار ہی میں مطالعہ کرتے کرتے گریجویٹ ہو گیا۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے شادی کی۔ یہاں تک کہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ لیکن اسے ابھی تک بس نہیں ملی جس پر سوار

ہو کر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے اور اسے یہ خوشخبری سنائے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن دہلی کا ہر مجنوں اتنا صابر و شاکر نہیں ہوتا کہ اپنی ساری عمر بس کے انتظار میں گزار دے۔ چنانچہ وہ لپک کر، جھپٹ کر، پھرک کر، دوڑ کر، بھاگ کر بس کا تعاقب کرتا ہے اور اس نامعقول محبوبہ کو کسی نہ کسی طرح پکڑ لیتا ہے اور جب بس سے اتر کر گھر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔ پتلون گھٹنے پر سے پھٹ گئی ہے۔ جیب کسی بلیڈ سے کٹ چکی ہے اور ماتھے سے خون بہہ رہا ہے اور گھر جانے کی بجائے اسے ہسپتال جانا چاہیئے۔

لیکن آہ! ہسپتال جانے کے لئے بھی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس ذلت و خواری کے باوجود جب صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے تو دہلی کے ہر بس سٹاپ پر میلوں لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ دہلی کی آدھی آبادی ان قطاروں میں سمٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر رات گئے تک بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دہلی کے باشندے اپنی آدھی عمر بسوں کی نذر کرتے ہیں اور باقی آدھی عمر بسوں کے متعلق سوچنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اس نے گذشتہ چھ ماہ سے اپنے بچوں سے بات نہیں کی کیونکہ صبح وہ بس نہ ملنے کے خوف سے جلدی گھر سے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت بچے سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور جب رات کو دیر سے بس ملنے کے سبب گھر پہنچتا ہے تو بچے پھر سو چکے ہوتے ہیں۔

دہلی کی بسیں عہدِ حاضرہ کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہیں جو انسانوں کی عمر لذیذ لقمہ سمجھ کر کھائے جا رہی ہیں۔

دہلی کے بائیسکل

دہلی بابوؤں اور بائیسکلوں کا شہر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بابوؤں نے بائیسکلوں کو جنم دیا۔ کئی کہتے ہیں بائیسکلوں نے بابو پیدا کئے۔ مگر میری رائے ہے کہ دونوں جڑواں پیدا ہوئے۔ اگر بابوؤں اور بائیسکلوں کو دہلی سے نکال دیا جائے تو دہلی بیوہ ہو کر رہ جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا ماتھے پہ دو ہتڑ مار کر کہے "اب کیا فائدہ جینے کا۔ مرحوم ہی کے دم سے تو میرا سکہ چلتا تھا۔"

یہ حقیقت ہے کہ بائیسکل اور بابو کی برکت ہی سے انڈیا کی عظیم ری پبلک چل رہی ہے۔ ہر روز صبح بائیسکلوں کے غول کے غول دہلی کے گلی کوچوں سے نکل نکل کر سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں جو بابوؤں کو اپنے کندھے پر سوار کئے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اگر دہلی کی سڑکوں پر بائیسکل چل رہے ہوں تو سمجھ لیا جائے کہ ہندوستان کی حکومت چل رہی ہے ورنہ نہیں۔ سرزمین ہندوستان پر حکومت کی باگ ڈور بائیسکلوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اگر بائیسکل نہ ہو تو بابو دفتر نہیں جا سکتا اور جب بابو دفتر نہیں جاتا تو ہندوستان کا وزیر اعظم تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی بائیسکل آئے تو وہ حکومت کا کاروبار چلائے۔ شاید دنیا کی کوئی سلطنت بائیسکل کی اتنی محتاج نہیں رہی جتنی موجودہ زمانہ کی گورنمنٹ آف انڈیا۔

میرا خیال ہے اس مرتبہ اگر دہلی اجڑی تو صرف اس بنا پر اجڑے گی کہ بائیسکل فیکٹریاں بائیسکل بنانا بند کر دیں اور بابو لوگ یہ شعر پڑھتے ہوئے دہلی سے نکل جائیں کہ ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم سائیکل اسدؔ — ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کس پہ چڑھیں؟

جیسا کہ میں نے کہا کہ بابو اور بائیسکل دونوں جڑواں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے دونوں کے فضائل اور مسائل بھی ایک دوسرے سے بے حد مشابہ ہیں ــــ بائیسکل ارزاں ترین سواری ہے اور بابو ایک ارزاں ترین ملازم ہے۔ بائیسکل پر آپ جتنا بوجھ لاد دیجیئے۔ اُف نہیں کرتی۔ بابو پر آپ جتنی فائلیں لاد دیجئے اٹھا لیتا ہے۔ آپ بائیسکل مرمت نہ کریں تو بھی کام چلتا رہتا ہے۔ بابو کے انجر پنجر بھی چاہے جتنے ڈھیلے ہو چکے ہوں کام کرتا رہتا ہے۔ بائیسکل کچھ نہیں کھاتی، تھوڑی سی ہوا بھر دو، چل پڑے گی۔ بابو بھی کچھ نہیں کھاتا۔ صرف اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر دو کہ وہ بابو ہے اپنے دفتر کا بادشاہ۔ بابو چلتا رہے گا۔ بائیسکل کو تھوڑی سی گریس چاہیئے، بابو کو دو روٹیاں اور چٹنی چاہیئے۔ زیادہ عیاشی کریگا تو دفتر کی کینٹین میں چائے کا ایک کپ پی لے گا اور پھر تر و تازہ ہو کر اپنی بائیسکل کو اٹھا کر لتا منگیشکر کے فلمی بول گنگناتا ہوا چل پڑے گا۔ وہ اپنی بائیسکل کو "بیوک کار" کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے آپ کو سلطنت کا اصل بادشاہ سمجھتا ہے۔ بائیسکل پر بیٹھا ہو تو بیش قیمت کاروں کو حقارت سے دیکھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہو تو بڑے سے بڑے سیٹھ کو پھٹکار کر کہہ دیتا ہے ــ "سیٹھ صاحب! اس وقت میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کل آنا۔"

دہلی کا بابو اپنی بائیسکل کی فطرت خوب سمجھتا ہے اور اسے مرسا نچے میں ڈھال لیتا ہے۔ بابو کی طرح بائیسکل بھی بڑی لچکیلی فطرت رکھتی ہے۔ بابو کبھی اسے ایروپلین کی طرح چلاتا ہے۔ کبھی پیادہ فوج کی طرح چلاتا ہے، اس کے پیچھے فائلیں باندھ لیتا ہے، کبھی آٹے کی بوری رکھ لیتا ہے، کبھی گھر کے سودا سلف کی گٹھڑی باندھ لیتا ہے اور کبھی جب چھٹی کے دن تفریح کے لئے نکلتا ہے تو اسی اپنی واحد وفادار بائیسکل پر اپنے تین چار بچوں اور بیوی کو لاد کر سارا

دہلی شہر گھماتا ہے اور پھر بڑے فخر سے اپنی بیوی سے کہتا ہے "منے کی ماں! چاہے تم میرا ساتھ چھوڑ جاؤ۔ لیکن یہ بائیسکل میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیگی یہ تم سے بھی زیادہ وفادار جیون ساتھی ہے اور سدا سہاگن ہے"۔

بائیسکل اور بابو کی جوڑی مستقل اور پائیدار ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کا سہاگ اسی جوڑی پر قائم ہے۔

دہلی کے تانگے ———— •

دہلی میں تانگے بھی چلتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ چلتے تھے۔ کیونکہ آجکل تو وہ حسرت سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں کہ کبھی جن سڑکوں پر وہ مغل شہزادوں کی طرح گردن اٹھائے چلا کرتے تھے ان پر کاریں، اسکوٹر اور بسیں چل رہی ہیں سڑکوں کی مغل سلطنت ان سے چھن چکی ہے اور اگر کبھی کبھار کوئی تانگہ سڑک پر چلتا ہوا دکھائی دے بھی جائے تو یوں شرماشرما کر، اچک اچک کر سہم سہم کر کنی کترا کترا کر چلتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے کہ سلطنت کا معزول شہزادہ جارہا ہے ———— "رائل فیملی" سے تانگہ کے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں لیکن ان تعلقات کا احساس ابھی نہیں ٹوٹا۔ اور احساس کا نہ ٹوٹنا ہی سب سے زیادہ دردناک ہے۔ احساس کے بغیر تانگے کو مکمل "نروان" حاصل نہیں ہو سکتا۔

لوہے کی مشین نے تانگے کو پچھاڑ دیا ہے۔ پٹرول اور انجن اسے بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں جس سے تانگے میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے دہلی کی بڑی بڑی سڑکوں پر نکلنا چھوڑ دیا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی سڑکوں گلیوں کوچوں کے اندر سمٹتا جارہا ہے۔ دہلی کی زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے اور اتنے دور دور کے علاقوں تک پھیل گئی ہے کہ بیچارہ تانگہ اس تیز رفتار زندگی کا ساتھ نہیں دے

سکتا۔ اس لئے یہ صرف ان تنگ و تاریک اور پسماندہ علاقوں میں محدود ہوتا جارہا ہے جن میں داخل ہونا لوہے کی مشین اپنی توہین سمجھتی ہے۔ مگر لوہے کی مشین کا کوئی اعتبار نہیں، کب اپنی عارضی توہین کا لبادہ پھاڑ کر پھینک دے اور تانگہ کو اپنی سلطنت کی آخری پناہ گاہوں سے بھی باہر نکال دے اور محکمہ آثار قدیمہ، دہلی کے آخری تانگے کو اٹھا کر لال قلعہ کے اندر ایک کونے میں محفوظ کر کے رکھ دے، تاکہ غیر ملکی سیاح آکر اس "ہندوستانی عجوبہ" کو دیکھیں اور اس کا فوٹو لے کر امریکہ کے "لائف میگزین" میں تفریح کے لئے شائع کیا کریں ــــــ

دہلی کا تانگہ کبھی رئیسوں کی سواری سمجھا جاتا تھا۔ رئیسوں نے کاریں خرید لیں تو تانگے نے عوام کی سرپرستی قبول کر لی۔ لیکن اب عوام بھی اسے دعا دیتے جا رہے ہیں اور وہ بھی تانگوں کی بجائے بائیسکلوں کو ترجیح دینے لگے ہیں کیونکہ وہ بائیسکلوں سے بھی وہی کام لینے لگے ہیں، جو تانگوں سے لیا کرتے تھے یعنی بائیسکلوں کو بار برداری کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تانگے کی طرح بائیسکلوں پر بھی گھر کی چار چار سواریاں بٹھا لیتے ہیں اور تانگوں سے شرط باندھ لیتے ہیں کہ آؤ، ریس لگا کر دیکھ لو، ہم تم سے پہلے منزل مقصود پر پہنچ جائینگے۔

غرض دہلی کے تانگے اپنے آخری دن جوں توں کر کے کاٹ رہے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ وہ شاید اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ایک بار پھر رئیسوں کی سواری بن جائیں گے اور کبھی کبھی کوئی رئیس زادہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ململ کا کرتہ یا اچکن پہن کر، دوپلی سر پر لگائے، پان کی گلوری منہ میں دبائے، شام کو تانگے پر سیر کے لئے نکلے اور لوگ ہاک اُچک اُچک کر اسے یوں حیرت سے دیکھیں، جیسے بچے شہر میں گھومتے ہوئے سرکس کے ہاتھی کو دیکھتے ہیں۔

دہلی کی کاریں ———— •

دہلی کی سڑکوں پر کاریں بھی گھومتی ہیں اور پارلیمنٹ کے ممبران بھی، لیکن راہ چلتے لوگوں کو دونوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا کہ سڑک پر کوئی کار جا رہی ہے یا ممبر پارلیمنٹ۔ کیونکہ جب کوئی چیز عام ہو جائے تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ دہلی میں کاریں اور ممبران پارلیمنٹ دو بہت عام چیزیں ہیں اس لئے جب وہ سڑکوں پر چلتے ہیں تو صرف انہیں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کار ہے یا پارلیمنٹ کا ممبر ہے۔

جب کوئی کار والا سڑک پر چلتا ہے تو نجانے کیوں اُسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سڑکیں اور پٹرول پمپ صرف اسی کے لئے بنائے گئے ہیں اور باقی یہ جو لاریاں، بسیں، بائیسکلیں، سکوٹر وغیرہ چل رہے ہیں۔ کالے رنگ کے ریڈ انڈین ہیں اور بدقسمتی سے ڈیموکریسی نہ ہوتی۔ تو انہیں ان سڑکوں پر چلنے کی ممانعت کر دی جاتی، جن پر کاریں چلتی ہیں ———— چنانچہ کار والا ان کی طرف ناک سکوڑ کر دیکھتا ہے اور بڑبڑا کر کہتا ہے۔ "ابے اندھا ہے، دیکھتا نہیں، کار آ رہی ہے۔ راستہ چھوڑ دے، یُوں سڑک پر چل رہا ہے، جیسے تیرے باپ دادا کی ملکیت ہے، ہٹ جا، ورنہ چالان کروا دونگا۔ جانتا بھی ہے، ٹریفک پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میرے داماد کا بھائی ہے!" ابھی چند سال پہلے دہلی پر صرف ان کے پاس کار ہوتی تھی جن کے پاس کوٹھی ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کوٹھی کی شرط اُڑ گئی۔ اور اب تو اس آدمی کے پاس بھی کار ہے جس کے پاس صرف دو کمروں والا کوارٹر ہے۔ میں نے ایک ایسے آدمی کے پاس بھی کار دیکھی ہے، جو غالب کے شعر غلط پڑھتا ہے اور ایک ایسا آدمی تو

تین کاروں کا مالک ہے جو چند سال پہلے ایک تموز پر روٹیاں لگانے کا کام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک پہلوان کے پاس بھی کار ہے اور وہ صبح اکھاڑے میں جاتا ہے تو کار پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ دہلی میں بھانت بھانت کی کاریں گھومتی ہیں۔ ان کے رنگ، سائز، وزن، شکل و صورت میں فینسی ڈریس شو کا سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ایسی کاریں بھی چلتی ہیں جن پر لوگ گھاس لادتے ہیں۔ اور ایسی کاریں بھی ہیں جو دور سے جیٹ ہوائی جہاز معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ سب کاریں ہی کہلاتی ہیں۔ چاہے کسی کے پاس کار کے لئے گیراج تک نہ ہو مگر وہ اسے گھر کے باہر سڑک یا گلی میں یوں کھڑا کر لیتا ہے جیسے کار نہ ہو کوئی کٹنے بھینس ہو۔

دہلی کی حسینائیں

دہلی میں حسینائیں یوں گھومتی ہیں جیسے جنگل میں شیر گھومتے ہیں۔ دہلی پر ان کا راج ہے۔ جہانگیر نے شراب کے ایک پیالے پر اپنی سلطنت نورجہاں کو دے دی تھی، دہلی کے موڈرن جہانگیر صرف کافی کے ایک پیالے پر سلطنت نچھاور کر دیتے ہیں۔

دہلی کی بیشتر حسینائیں دہلی کے کھیتوں سے نہیں اگتیں بلکہ باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ دہلی کی اوریجنل حسینائیں اقلیت میں ہیں اور یہ چھوٹی سی اقلیت بھی اب ہولے ہولے "رائل فیملی" میں شامل ہو رہی ہے۔ درآمد شدہ حسیناؤں نے جب دہلی پر جارحانہ حملہ کیا تھا تو دہلی کی اوریجنل اور قدیم حسیناؤں کے پیلے پیلے طلائی رخسار غصہ سے لال پڑ گئے تھے لیکن حملہ آور زیادہ موڈرن ہتھیاروں سے مسلح تھیں، اس لئے قدیم حسیناؤں نے معمولی مزاحمت کے

بعد ہتھیار ڈال دئے اور پھر آہستہ آہستہ خود بھی موڈرن حسیناؤں کے سانچے میں ڈھل گئیں اور جنگل پر راج کرنے میں حملہ آور حسیناؤں کے ساتھ ساجھی دار بن گئیں ۔

ایک مورخ نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا " ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ سامراجی حملہ آوروں کے کلچر کو یہاں کے اصلی باشندے اپنا لیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب اصلی باشندے بھی حملہ آور سامراجی حاکم معلوم ہونے لگتے ہیں ۔

آزادی کے بعد دہلی ایک کاسموپالیٹن (CORMO-POLITON) شہر بن گیا ہے ۔ اس لئے یہاں کی حسینائیں بھی کاسموپالیٹن قسم کی حسینائیں بن گئی ہیں ۔ بنگال کی جادو کرنے والی کالی، لمبی زلفیں، سندھ کے پُر بہار ریگ زاروں میں کھلی ہوئی ولایتی سکرٹوں کے پھول لگاکر، جب مدراسی برہمن زادیوں کی سانولی، سڈول اور رقص کرتی ہوئی پنڈلیوں پر، پنجاب کے سنہرے مکئی کی طرح شوخ و شنگ چمکیلے رخساروں پر شلوار قمیض کا سایہ ڈالتی ہیں تو یورپ کی نیلگوں آنکھوں اور بھورے کٹے ہوئے بالوں پر بھی یہ جنون سوار ہو جاتا ہے کہ بنارسی ساڑی پہن کر بازار میں نکلیں اور آتشِ شوق میں کاسموپالیٹن حرارت پیدا کرلیں اور جدھر بازار سے گزریں، کشتوں کے پشتے لگا دیں اور حسن کو عالمگیر بنا دیں اور عاشقوں کو "کنفیوز" کر دیں کہ نگاہ ٹھہرے تو کہاں ٹھہرے ۔ کس پر ٹھہرے کہ کانگڑی کی بھرپلی حسینہ اور کشمیر کی گلنار بیر بہوٹی دونوں بیک وقت دل کو کھینچ لیتی ہیں اور یہ بھی نہیں سوچنے دیتیں کہ دل کس کے حوالے کریں ۔ پانچ منٹ پہلے ایک جاپانی گڑیا جو دل لے گئی تھی اب اسے کس منہ سے کہیں کہ محترمہ! ایک افغان زادی ہم سے دل لینے کا مطالبہ

کررہی ہے۔ براہِ کرم ہمارا دل لوٹا دو کہ سے

یہاں عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

دہلی کی حسیناؤں کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے متعلق کوئی اعداد وشمار نہیں ملتے۔ محکمہ مردم شماری اس سلسلہ میں خاموش ہے کیونکہ رُولز کے مطابق، حسن شماری اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے لیکن عام اندازہ یہ ہے کہ حسیناؤں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک مستقل قسم کے "سڑک گرد" عاشق کا حلفی بیان ہے کہ وہ ایک سڑک پر گذشتہ دس برس سے حسن شماری کررہا ہے لیکن ہر روز اس سڑک پر ۵۰ فی صدی نئی حسینائیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ نہ جانے وہی حسینائیں بھیس بدل کر سامنے آجاتی ہیں یا کسی چھپے ہوئے ریزرو سٹاک میں سے نیا مال نکال کر مارکیٹ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس لئے تعداد کے اضافہ کی صحیح رفتار کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آجائے گا۔ جب دہلی شہر کی ہر "صنفِ نازک" حسینہ بن چکی ہوگی اور ہر حسینہ لاکھوں دل اپنے پرس میں چھپائے پرس جھلاتی نظر آئے گی اور اس وقت شاید اُن کی تعداد کا شمار کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا کیونکہ حُسن کی نگری میں یہ عام رحجان پھیل رہا ہے کہ لباس کی موڈرن ٹیکنیکی اور کپڑے کی تراش خراش ہی کو حُسن کی بنیاد بنا دیا جائے اور لباس ہی کو ایک ایسا پاورفل سورج بنا دیا جائے جس کی چکا چوند میں، نین نقش کے سبھی چھوٹے موٹے ستارے اوجھل ہو جائیں ——— عشق کے لئے یہ ایک بہت جانکاہ اور آزمائشی دور ہے کہ لب ورخسار کی قدیم ترازو میں لباس نے ڈنڈی مارنا شروع کردی ہے اور

بے چارے عاشق حیران ہیں کہ اس ڈنڈی سے دل کی قدر و قیمت کو بچائیں یا حسین سوداگروں کی اس سٹے بازی میں نقد دل و جان لٹا کر ہار مان لیں۔

دہلی کی حسیناؤں کی لیڈر شپ یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ دل لینے کے نت نئے ڈھنگ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شام کو یونیورسٹی کی ایک حسینہ جوگیے رنگ کا لمبا کرتہ زیب تن کر کے میدانِ کارزار میں اتر آتی ہے تو دوسری شام کو دہلی کی تمام حسینائیں جوگنیں بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور ابھی تیسری شام پوری طرح ختم نہیں ہوتی کہ یونیورسٹی کی کوئی اور حسینہ جوگیا لباس اتار کر تنگ پتلون پہن لیتی ہے جیسے وہ حسینہ نہ ہو بلکہ ریس کورس کی چاق و چوبند گھڑ سوار ہو۔ چنانچہ چوتھی شام دہلی کے کوچہ و بازار گھڑ سوار حسیناؤں کا ریس کورس بن جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دہلی کے سلم ایریا میں رہنے والی رام جی داس کلرک کی میٹرک پاس بیٹی جو اسّی روپیہ مہینہ پر ٹائپسٹ کا کام کرتی ہے، نزدیکی ٹیلر ماسٹر کو تنگ پتلون تیار کرنے کا آرڈر دے آتی ہے اور جب ایک ہفتہ بعد پتلون پہن کر اپنے دفتر جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوتی ہے کہ فیشن بدل گیا ہے اور حسیناؤں نے کوئی "ٹرائی کلر" لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔

دہلی کی حسیناؤں کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ان کی زلفوں کی طرح اس کہانی کے بھی کئی پیچ، کئی خم اور کئی سٹائل ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہہ کر اسے ختم کرتا ہوں۔ دہلی کی حسینائیں وہ لیلائیں ہیں جو مجنوؤں پر جان نثار کرنے کی قائل نہیں ہیں صرف کبھی کبھار ایک آدھ خودکشی کی خبر آجاتی ہے — حسیناؤں کی تعداد کے اعتبار سے خودکشیوں کی یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن نمک کی اس کمی پر کسی حسینہ کو کفِ افسوس ملتے نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ

خودکشی کا مذاق اڑا کر نمک چھڑکتے ہی دیکھا گیا ہے۔

دہلی کے عاشق

دہلی کے عاشقوں کی سب سے بڑی ٹریجڈی (بلکہ کامیڈی) یہ ہے کہ ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہ صرف دہلی کی حسیناؤں کے گنبد کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ دہلی کے کسی عاشق کو الگ کر کے دیکھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ کیونکہ وہ کسی نہ کسی حسینہ کے دوپٹے میں تنکے کی طرح اٹکا ہوا نظر آئے گا اور وہ تنکا دوپٹے کے بغیر آپ کو لاوارث نظر آئے گا۔ دوپٹہ ہی اس کی ہستی کی ضمانت ہے اور اگر آپ اسے دوپٹے سے الگ کر کے دیکھنا چاہیں گے تو وہ یوں لگے گا جیسے سگریٹ کی راکھ زمین پر گر گئی ہے۔

دہلی میں عاشقوں کی تعداد حسیناؤں سے کئی سو گنا زیادہ ہے۔ تعداد کے اس بے ہنگم اضافہ نے عشق کا معیار گرا دیا ہے اور عاشق لوگ اس گرے ہوئے معیار کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ عشق اندھا ہوتا ہے۔ مجھے ایک عاشق کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جس کا تعاقب کرنے کے لئے ہر روز بائیسکل پر پندرہ پندرہ میل کا سفر کرتا رہا اور آخر ایک دن جب اس کی محبوبہ نے وفورِ محبت میں اس سے پوچھا "پیارے! میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ پر کچھ نچھاور کروں۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

جواب میں عاشق کے منہ سے بے ساختہ نکلا "پیاری! مجھے ایک سکوٹر لے دو۔ مجھ سے اب زیادہ بائیسکل نہیں چلائی جاتی"۔

دہلی کا عاشق حساب کتاب کا عاشق ہے۔ وہ عشق کو بائیسکل اور سکوٹر سے تولتا ہے۔ وہ بے حد چوکنا ہو کر دیکھتا رہتا ہے کہ حسینہ کے حسن کی کیا قیمت ہے

وہ کافی کے کتنے کپ اُسے پلا چکا ہے اور اس کے بدلے میں اسے کتنی مسکراہٹیں مل چکی ہیں۔ اگر محبوبہ کی طرف سے ملی ہوئی مسکراہٹوں کی تعداد کم ہے تو عاشق کا نازک شیشۂ دل چور چور ہو جاتا ہے اور وہ محبوبہ پر بے وفائی کا الزام لگا دیتا ہے۔ اگر زیادہ ذکی الحس ہو جائے تو مسکراہٹیں کم ہونے کے غم میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے، راتوں کو تارے گنتا ہے اور فلمی گیت گنگناتا ہے اور کافی کے بلوں کے غیر متوازن بجٹ کو اس طرح پورا کرتا ہے کہ بڑھیا بلیڈوں کی بجائے گھٹیا بلیڈ استعمال کرنے لگتا ہے بلکہ کئی بار تو ہفتوں شیو نہیں کرتا۔ اور آزردہ حال ہو کر یہ شعر بڑے رقت انگیز لہجہ میں گاتا ہے ؎

اِک بے وفا سے پیار کیا، ہائے کیا کیا
خود کو ذلیل و خوار کیا، ہائے کیا کیا

دہلی کے عاشقوں کی ایک اور بلند پایہ قسم بھی ہے جو حسن کا مول تول نہیں کرتی بلکہ اپنے عشق کا مول تول کرتی ہے۔ اس قسم کے عشق میں کافی کے پیالے نہیں گنے جاتے اور نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ حسن کے تعاقب میں کار کا کتنا پٹرول ضائع ہوا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ عاشق کو سوشل اور اقتصادی طور پر کہیں ہیٹا تو نہیں سمجھا جا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں مکانوں کے کرائے کی طرح حسیناؤں کا ریٹ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ بلڈنگ کا کرایہ جتنا زیادہ ہوگا بلڈنگ کی سماجی حیثیت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی۔ اس قسم کے گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے مالک مکان قسم کے عاشقوں نے جہاں عشق کا مارکیٹ ریٹ بہت بڑھا دیا ہے وہاں محبوباؤں کے دماغ بھی بگاڑ دئیے ہیں اور عشق کے مفہوم کو بنک بیلنس کی سالانہ رپورٹ بنا دیا ہے ـــــــ آپ کے پاس کار ہے یا تانگہ۔ یا آپ صرف کسی پبلک پارک میں ایک آنے کی مونگ پھلی ہی سے محبوبہ

کا دل رجھا رہے ہیں ؟ کار، تانگہ اور مونگ پھلی میں جتنا فرق ہوتا ہے، اسی فرق کی بنیاد پر عشق کیا جاتا ہے اور ان چیزوں کو پرکھنے کی کسوٹی صرف حسیناؤں کے پاس ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ دہلی کے عاشق کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے حسیناؤں کے پاس ہے۔ دہلی کے عاشق حسیناؤں کے دوپٹے کے تنکے ہیں۔ اس تنکے کو الگ کرکے دیکھئے تو نہ کار کی حیثیت باقی رہتی ہے نہ بائیسکل کی۔ نہ پستے اور بادام کی نہ مونگ پھلی کی۔ غریب اور امیر دونوں قسم کے عاشق مول تول کا شکار ہیں اور یہ مول تول محبوباؤں کے اختیار میں ہے۔ عاشقوں کے اختیار میں تو صرف چند رومانٹک اشعار ہیں جنھیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے شب و روز بگاڑ رہے ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتے ہیں کہ وہ قیس اور رانجھے کی روایات کے وارث ہیں۔

دہلی کے عاشقوں کی ایک اور قسم بھی ہے جن کے پاس کوئی محبوبہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اپنے عشق کی کئی مفروضہ کہانیاں موجود ہیں اور وہ محفلوں میں، کلبوں میں، ریسٹورانوں میں اپنی ان محبوباؤں کے دلفریب قصے بیان کرتے رہتے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں اور اگر پیدا ہو چکی ہیں تو عاشقوں کے نام، پتے اور شکل سے آگاہ نہیں۔ مجھے ایسے ہی ایک عاشق سے ملاقات کا شرف حاصل ہے وہ راہ چلتی ہر تیسری حسینہ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ اس پر مرتی تھی اور آج کل دو بچوں کی ماں بن چکی ہے ——— فلاں موتیوں جیسے دانتوں والی حسینہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اس نے میرے ساتھ ساری عمر گزارنے کا عہد کیا تھا لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بیوقوفی پر میں نے اسے دھتا بتا دیا وہ اپنی بے وقوفی اور میری بے نیازی کے باعث ابھی تک شادی نہیں کر سکی ——— اور فلاں نیلگوں ساڑی اور نیلگوں آنکھوں

والی حسینہ مجھے اغوا کر کے تاج محل تک لے گئی تھی لیکن جب میں نے کہا کہ میرے پاس پاس شاہجہاں کی طرح اتنا روپیہ کہاں ہے کہ تمہارے لئے بھی ایک تاج محل بنوا سکوں تو اس کا دل ٹوٹ گیا اور آج کل تاج محل کی بجائے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہے اور ایک کلرک کی بچے پیدا کرنے والی ٹائپ مشین بنی ہوتی ہے۔

یہ تمام معزز عاشق بڑے مزے کے لوگ ہیں کیونکہ وہ بڑے اچھے قصہ گو ہیں۔ ان کی کہانیاں سن کر عشق کی بلندی اور حسن کی پستی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ صرف اپنے عاشقانہ قصوں ہی سے اس خلاء کو پر کرتے رہتے ہیں جو محبوبہ کے نہ ہونے سے ان کی روح میں پیدا ہو گیا ہے۔

ان عاشقوں کی عمر کے متعلق جب کسی حسینہ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب مناسب حدود سے آگے بڑھ گئی ہے اور ان کی خودکشی کا خطرہ ہے تو ان میں سے کوئی حسینہ رحم کھا کر ان کی طرف بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ "اب سب قصے تمام ہوئے۔ اب شادی کر لو۔"

جس پر وہ نہایت اکتاہٹ اور بے بسی کے عالم میں "ہاں" کہہ دیتے ہیں اور کسی بینڈ پارٹی کا ایڈریس پوچھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ان کے فرضی عشق کے ماتم اور حقیقی شادی کی خوشی کی دھن بجا سکیں۔

ایسی کئی ماتمی خوشیوں میں شرکت کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہو چکا ہے۔

دہلی کے مکان

دہلی میں صرف دو قسم کے انسان رہتے ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔ ایک تیسری قسم بھی ہے جو "لامکان" کہلاتی ہے اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہے۔

فٹ پاتھوں پر، تھڑوں پر، پارکوں میں، پلوں کے نیچے، پلوں کے اوپر، برآمدوں میں، کھنڈروں میں، مگر یہ ضمنی قسم ہے۔ خدا کی طرح مکان سے بے نیاز ہے۔ حقیقی قسمیں دو ہی ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔

مالک مکان ــــــ مکان بناتے ہیں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ کرایہ داروں کے لئے دہلی میں جو مکان بنتا ہے۔ اس میں کرایہ داروں کے مزاج اور تمناؤں کو اینٹوں کی طرح چن دیا جاتا ہے۔ جن مکانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق مالک مکان سمجھتا ہے بیکار پیسہ ڈبویا۔ مکان کے نقشے ہی میں کرایہ داروں کے چہرے اور جیب فٹ کردی جاتی ہے بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کے لئے ابھی منظوری بھی نہیں آتی کہ اس پر کرایہ داروں کا بورڈ لگ جاتا ہے۔

دہلی میں ایسے مالک مکان بالکل گدھے سمجھے جاتے ہیں جو کرایہ دار نہیں رکھتے اور شکر ہے کہ دہلی میں گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجھے ایک ایسے ہی گدھے رئیس کے بارے میں معلوم ہے کہ اپنی کوٹھی میں کرایہ دار رکھنے کا سخت مخالف ہے لیکن اس نے ایک کمرہ اپنی بیوی کو کرایہ پر دے رکھا ہے، جہاں وہ اپنا پالتو کتا رکھتی ہے اور ایک سو روپیہ ماہانہ کرایہ دیتی ہے۔ ایک چپراسی مالک مکان نے اپنا آدھا مکان اپنے بیٹے اور بہو کو کرایہ پر دے رکھا ہے۔

چاٹ والے سے ممبران پارلیمنٹ تک ــــــ •

دہلی کے مکان، انسانوں کے لئے نہیں، کرایہ کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک صاحب اپنے مکان کے سامنے تھڑا بنا رہے تھے، میں نے عرض کیا، یہ تھڑا کس لئے؟ فرمانے لگے " ایک چاٹ والے کو کرایہ پر دینا

ہے" ــــــ دہلی میں سیڑھیاں تک کرایہ پر چڑھانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ دراصل دہلی کے ہر باشندے کی رُوح کرائے کی رُوح ہے۔ رُوح کو بھی سیڑھی اور کھٹڑا سمجھ کر کرایہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی ممبران پارلیمنٹ بھی ایسے ہیں جو اپنی ضمیر اور مکان دونوں کو کرایہ پر دے دیتے ہیں۔ (حالانکہ یہ ممبر خود بھی کرایہ دار ہوتے ہیں) اور پھر خود ہی پارلیمنٹ میں کرائے کی روحوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اس طرح اپنے "گناہ" کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

اس اعتبار سے دہلی میں کوئی مالک مکان، خالص مالک مکان نہیں ہے کیونکہ اگر وہ کرایہ دار نہیں رکھتا تو اپنے آپ سے ہی اپنے مکان کا کرایہ وصول کر لیتا ہے۔

دہلی مکانوں کا شہر

دہلی صرف مکانوں کا شہر ہے۔ آزادی کے بعد یہاں صرف مکان بنے ہیں۔ ان کے سوا ہر چیز بگڑ گئی ہے مکان خوبصورت ہو رہے ہیں، انسان بھدّے ہو رہے ہیں خدا نے انسان کو جتنا حُسن عطا کیا تھا وہ سب مکانوں پر لگا دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ صرف کرائے کے پیسے رہ گئے۔ یہاں تک کہ خدا کے مکانوں میں بھی کرایہ دار رکھ لئے گئے ہیں جو پیٹ کی خاطر خدا کو کرایہ پر چڑھاتے ہیں اور خدا سے داد پاتے ہیں۔

دہلی کے مکانوں کی طرزِ تعمیر میں "کرایہ آرٹ" مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ کہنے کو دہلی کے سبھی آرکیٹکٹ یہی کہتے ہیں کہ فلاں مکان میں مغل آرٹ ہے، فلاں میں یوروپین آرٹ اور فلاں میں چینی آرٹ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکانوں

کے سبھی سٹائل "کرایہ آرٹ" کے گرد کولھو کے بیل کی طرح گھومتے ہیں۔ کرایہ داروں کی جتنی اقسام ہیں، اتنی ہی اقسام کے تعمیری آرٹ ہیں۔ آرٹ ضمنی چیز ہے، کرایہ دار بنیادی چیز ہے۔

یہاں کے مکان چار قسم کے ہیں:

(۱) قدیم مکان (۲) نئے بنگلے اور کوٹھیاں (۳) عوامی مکان (۴) سلم ایریا کی جھونپڑیاں۔

دہلی کے قدیم مکان ——————•

مکانوں کی یہ قسم پرانی دہلی میں پائی جاتی ہے۔ انہی مکانوں کی گلیوں کے بارے میں ذوق نے کہا تھا۔ ع

کون جائے ذوق اب دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

یہ گلیاں اتنی تنگ و تاریک اور بھول بھلیاں قسم کی ہیں کہ ان سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اس لئے انہیں چھوڑ کر جانا آسان نہیں — ذوق نے ٹھیک کہا تھا۔ ان سے باہر نکلنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں۔

قدیم طرز کے یہ مکان اس زمانے کے انسانوں کی گہری اور قریبی محبت کا ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں، اتنے جڑے ہوئے ہیں کہ ایک مکان کا باشندہ اپنی چھت پر کھڑا ہو کر دوسرے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے باشندے کا بوسہ لے سکتا ہے، مل کر ڈوئٹ گا سکتا ہے — ایک دوسرے کا سگریٹ سلگا سکتا ہے۔ غصہ آئے تو ہاتھ بڑھا کر تھپڑ مار سکتا ہے۔ ان مکانوں کی عورتیں اپنے گھروں سے نکلے بغیر ایک دوسری کو گالیاں اور کوسنے دے سکتی ہیں۔ دال، سبزی، املیس چینج کر سکتی ہیں۔ اپنی چھت پر کھڑے

کھڑے تعزیت تک کرلیتی ہیں ــــــــ غرض یہ قدیم طرز کے مکان دو انسانوں کے وصال اور قربت کا سمبل ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں "اے دنیا بھر کے لوگو! قریب آجاؤ۔ کیونکہ قربت ہی تمہارے دکھوں کا علاج ہے۔ نہ صرف علاج ہے بلکہ خود بھی ایک دکھ ہے۔ اس لئے دکھی ہونا چاہتے ہو تو ایک دوسرے کے مکانوں کو اتنا قریب لے آؤ کہ مردوں کو مورچے بنانے میں اور عورتوں کو سیاپہ کرنے میں سہولت ہو جائے"۔

یہی جذبۂ وصال وقربت ہے کہ اگر ان میں سے ایک مکان بھی گرے تو سیدھا دوسرے مکان پر گرتا ہے اور دوسرا مکان تیسرے پر ــــــ اور اس طرح ایک مکان کے گرنے سے ایک ساتھ تین چار مکان گر جاتے ہیں۔ جیسے بچھڑے ہوئے اہلِ محبت ایک دوسرے پر بوسے ثبت کر رہے ہوں۔ اور چونکہ یہ قدیم مکان ہیں۔ اس لئے عام طور پر گرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کا گرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دہلی کے قدیم کلچر کی یادگار ہیں انہیں محفوظ رکھنے کے لئے برابر اینٹیں اور پلستر لگائے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں قربانیاں بھی دی جاتی ہیں اور ہر سال مکان گرنے سے بہت سے لوگ ملبے کے نیچے آکر شہید ہو جاتے ہیں۔

جب یہ قدیم مکان ملبے بن جائیں گے، دہلی کا قدیم کلچر بھی ملبہ بن جائیگا اور انشاء اللہ وہ دن بہت جلد آرہا ہے۔

کوٹھیاں اور بنگلے ــــــــ•

مکانوں کی دوسری قسم کوٹھیاں اور بنگلے ہیں ان کی طرزِ تعمیر میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں مصری، ایرانی، امریکی۔ فرانسیسی، روسی، جاپانی،

افریقی رُوح نظر آئے۔ مگر ہندوستان ہرگز نظر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی رُوح مفلس ہے اور یہ کوٹھیاں اور بنگلے امیر لوگ بنواتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر مفلس ہندوستان کا سایہ پڑے۔ اس لئے وہ اپنی کوٹھیاں مفلس عوام کی "چشمِ بد" سے دور شہر کے باہر بنواتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنی کوٹھیاں شہر کے باہر ہی نہیں، ہندوستان سے بھی باہر تعمیر کروائیں!

عوام سے دُور شہر سے باہر کوٹھیاں بنوانے کا رُجحان آہستہ آہستہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ شہر کے باہر کوٹھیوں اور بنگلوں کا ایک اور شہر بن گیا ہے۔ اور یہ بڑے لوگ بہت پریشان ہیں کہ اب کیا کریں۔ وہ اس دوسرے شہر سے بھی باہر جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ عوام سے دُور اور فطرت کے نزدیک جا بسیں۔ لیکن وہ جوں جوں جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں، شہر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ چنانچہ اب دہلی کے اردگرد جنگل اور پہاڑ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جنگل اور پہاڑوں میں کوٹھیاں اور بنگلے نمودار ہو گئے ہیں۔ فطرت غائب ہو گئی ہے۔ افلاس اور سرمایہ کی ریلیں نے فطرت کو روند ڈالا ہے، مار ڈالا ہے، فنا کر دیا ہے۔

ان کوٹھیوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو دہلی (بلکہ ہندوستان) پر راج کرتے ہیں۔ کار، بل ڈاگ، ہرے ہرے لان، برقی قمقمے، مصوروں کے قیمتی شاہکار، ریشم و کمخواب، دودھ اور چاندنی میں دُھلی ہوئی عورتیں، ڈرائنگ رُوم، سلیپنگ رُوم، ریڈنگ رُوم، ویٹنگ رُوم، ڈائننگ رُوم، ——.. پنگ پانگ رُوم، چلڈرن رُوم۔ ڈانس رُوم۔ انگریزی میں ہنسنا، رونا، رُلانا عشق کرنا —— غرض راج کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ

سب ان کوٹھیوں میں جمع کرلی جاتی ہیں ۔ ان سب نعمتوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے ؟ یہ رائل فیملی کے شہزادے ہی جانیں، کیونکہ یہ ان کا "ٹریڈ سیکرٹ" (TRADE SECRET) ہے ۔

ہاں! دہلی میں ایک افواہ ضرور پھیلی ہوئی ہے کہ یہ سب نعمتیں وہی لوگ مہیا کرتے ہیں جن سے یہ شہزادے بھاگ کر جنگلوں کی طرف بڑھتے اور کوٹھیاں بناتے جارہے ہیں ۔

یہ کوٹھیاں اور بنگلے کرایہ پر مل جاتے ہیں لیکن ان میں صرف وہی کرایہ دار رہتے ہیں جو خود بھی رائل فیملی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کا کرایہ بھی شاہی ہوتا ہے ۔ کہتے ہیں ایک بار ایک سرکاری افسر نے جس کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ تھی، ایک کوٹھی ایک ہزار روپیہ ماہانہ کرائے پر لے لی ۔ وہ اپنی تنخواہ کرایہ میں دے کر کوٹھی کے باہر بیٹھ گیا اور ہر راہ چلتے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ۔ "بابا! خدا کے نام پہ ایک پیسہ دے دو ۔ بھوکا ہوں "

لیکن شام تک اسے بھیک میں ایک پیسہ تک نہ ملا ۔ کیونکہ ہر راہ چلتے نے یہی سمجھا ۔ ایسا سوٹڈ بوٹڈ آدمی بھکاری نہیں ہو سکتا ۔ مذاق کر رہا ہے ۔

عوام کے مکان ——————•

دہلی عوام کا شہر بھی ہے ۔ اس لئے ان کے مکان بھی ہیں، ان کے مکانوں کی وہی ساخت ہے جو عوام کی اپنی ساخت ہے ۔ عوام بھوک کے مارے ہیں ۔ اس لئے ان کے مکان بھی یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے صدیوں

سے بھوک ہڑتال پر ہیں ۔

عوام کے مکان عوام کے کلچر کو ظاہر کرتے ہیں ۔ اس لیئے ان کی تعمیر کے وقت بھی عوام کے کلچر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے ۔ ایک کمرہ، ایک رسوئی ۔ ایک باتھ ..... (مگر نہیں، باتھ رُوم کا کام رسوئی سے بھی لیا جا سکتا ہے) اور بس ——— اس سے زیادہ کی عوام کا کلچر اجازت نہیں دیتا ۔ اگر کسی عام آدمی کے پاس ایک کی بجائے دو کمرے ہوں تو اس کی بیوی یہ کہہ کہہ کر اس کی نیند حرام کر دیتی ہے کہ یہ دوسرا کمرہ کرائے پر اٹھا دو ۔ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے ۔ اور کچھ نہیں تو اس کرایہ سے بچوں کی نیکریں اور قمیض ہی بن جائیں گی ۔

عوام شاستروں کی انویائی ہیں ۔ اس لیئے ان کے مکان بھی شاستروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ۔ ان مکانوں سے صبر و قناعت ٹپکتی ہے ۔ حرص و ہوا کا ادھر کبھی گزر نہیں ہوتا ۔ اکڑفوں اور جھوٹا غرور انہیں چھو تک نہیں گیا ۔ ایک پاخانہ پندرہ عوامی کنبوں کے لیئے کافی ہے ۔ ایک غسل خانہ میں دس دس گھرانے اشنان کر لیتے ہیں ۔ ایک ہی کمرہ میں چار پائیاں، کرسیاں، الماری، ٹرنک، ریڈیو سیٹ، انگیٹھی، جوتے، کتابیں، برتن ——— ہر چیز سما جاتی ہے ۔ کیونکہ عوام کی تھیوری یہ ہے کہ دل بڑا ہونا چاہیئے ۔ مکان نہیں ۔ دل بڑا ہے تو اس میں کرسیاں بھی رکھی جا سکتی ہیں اور پانی کی پالٹیاں بھی ——— کئی لوگوں نے تو اپنے دل میں بچوں کے لیئے پلے گراؤنڈ تک بنا رکھے ہیں ۔ جسے دیکھ کر وہ خدا کا شکر بجا لاتے ہیں جس نے انہیں صوفہ سیٹ عطا نہیں کیا ورنہ وہ اسے کہاں رکھتے !

عوام کے ان مکانوں کی ایک اور کلچرل خصوصیت ہے وہ یہ کہ ان مکانوں کے ناموں میں تکلف اور جھوٹ روا نہیں رکھا گیا ۔ یعنی عوام نے

اپنے مکانوں کے "شیش محل" "پریم بھون" "قصرِ احمر" "آرام منزل" "عشرت کدہ" جیسے شان دار نام نہیں رکھے بلکہ ان کے مکانوں کے نام ہندسوں پر رکھے گئے ہیں۔ بلاک نمبر آٹھ کوارٹر نمبر پندرہ ——— چوبیس نمبر، اٹھائیس نمبر، پچاس نمبر ——— ان سیدھے سادے، غیر پیچیدہ ناموں سے عوام کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ عوام کو اب اپنے نام رکھنے کی ضرورت نہیں رہی یعنی اگر کسی کا نام گھنشیام لال ہے تو اسے گھنشیام لال کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے، اٹھارہ نمبر والا آیا تھا۔ کہتا تھا، بائیس نمبر والے کی بیوی اس کے تکیئے کا غلاف چرا کرلے گئی ہے۔ ہم نے چھبیس نمبر والے سے اس کی شکایت کی تو آٹھ نمبر والا باہر نکل آیا اور اس کی بے جا حمایت کرنے لگا۔

یعنی عوام کا کوئی نام نہیں رہا، مکانوں کا نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ عوام اب اپنے مکان کے نام ہی سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ عوام اب انسان نہیں رہے، مکان ہو گئے ہیں۔ عوام اور مکان میں بھید بھاؤ مٹ گیا ہے اور "تو من شدی، من تو شدم" کے مصداق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آتما، پرماتما میں مل جاتی ہے اور یہ عوام کے کلچر کی وہ بلند ترین منزل ہے جہاں سے خدا صرف ایک آدھ انچ آگے رہتا ہے۔

سلم ایریا کی جھونپڑیاں ———•

دہلی میں سلم ایریا کی جھونپڑیاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کا کوئی طرز تعمیر نہیں۔ یہ خودرو پودوں کی طرح اگتی ہیں اور خود بخود مرجھا جاتی ہیں یہ عام طور پر گندے نالوں، نشیبی علاقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے آس پاس بنائی

جاتی ہیں۔ بظاہر یہ دہلی کے ماتھے پر داغ معلوم ہوتی ہیں لیکن اس داغ کے بغیر دہلی کا ماتھا مکمل نہیں ہوتا۔ اِس لئے جب دہلی کے ماتھے کو صاف کرنے کے لئے ایک جھونپڑی گرائی جاتی ہے تو دو نئی جھونپڑیاں جنم لے لیتی ہیں دہلی کے مہذّب حُکام کا خیال ہے کہ جب تک ان جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو ختم نہیں کیا جائے گا، یہ جھونپڑیاں ختم نہیں ہوسکتیں۔ لیکن جھونپڑیوں والے چونکہ سماج کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لئے وہ ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تہذیب کی کوکھ کو بانجھ کرنا کسی کے بس کا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے نمائندے ان جھونپڑیوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ انہیں پانی، بجلی اور نالیاں مہیّا کرتے ہیں۔ انہیں ووٹروں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں سکول تک کھول دیتے ہیں۔ کبھی ان کے حق میں اور کبھی ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں تاکہ یہ غلاظت قائم رہے، زندہ رہے۔ کیونکہ جمہوریت کو زندہ رکھنے کا یہی تقاضا ہے کہ کوٹھیاں اور جھونپڑیاں دونوں ساتھ ساتھ جیتی رہیں اپنا اپنا سٹیٹس قائم رکھیں۔ ایک دوسرے کی طرف نگاہِ بد سے نہ دیکھیں۔

دہلی کے ایک بہت بڑے نیتا نے ایک بار انہی جھونپڑیوں کو دیکھ کر کہا تھا ــــ "میں جب ان جھونپڑیوں کی طرف دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں!"

چنانچہ انہیں ایک رومال پیش کر دیا گیا جس سے انھوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور پونچھنے کے بعد عوام کے ہاتھ بیچ دیا۔
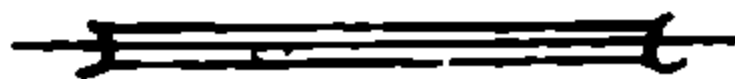
اُوٹ پٹانگ

جب ہم چھوٹے تھے

جب ہم چھوٹے سے تھے تو کافی اوٹ پٹانگ باتیں سوچا کرتے تھے مثلاً یہ کہ کوہ ہمالیہ کو اٹھاکر بحرِ ہند میں پھینک دیں گے اور بحرِ ہند کو خشک کرکے وہاں گیہوں اُگا دیں گے۔ نجانے ہم گیہوں اُگانے کی بات کیوں سوچتے تھے؟ حالانکہ انگور بھی اُگا سکتے تھے۔ لیکن گاؤں کا نمبردار کہتا تھا کہ گیہوں کے اردگرد ہی ہر چیز گھومتی ہے۔ نمبردار کی گھوڑی، پٹواری کی سلکی پگڑی، پجاری کے ماتھے کا تلک، تحصیلدار کا چابک ہر چیز گیہوں کے گرد رقص کرتی ہے حتیٰ کہ کوہ ہمالیہ بھی گیہوں کے بیج سے اُگا تھا۔

لہٰذا ہمارے دل و دماغ پر گیہوں کی خاصی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمالیہ سے بھی زیادہ، بحرِ ہند سے بھی زیادہ، نمبردار کی گھوڑی سے بھی زیادہ۔

ایک مرتبہ ہماری والدہ محترمہ نے ہمیں گیہوں کی بجائے باجرے کی روٹی پیش کی۔ ہم نے سوچا (یعنی اوٹ پٹانگ سوچا) کہ یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اگر ہمیں گیہوں کی روٹی نہ ملی تو ہم کوہ ہمالیہ کو کس طرح اٹھا کر پھینکیں گے۔ چنانچہ ہم نے باغیانہ اعلان کر دیا کہ ہم باجرے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔

والدہ محترمہ نے ہمیں تھپڑ عرض کیا (ہم والدہ کو بھی اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے) اور فرمایا "اے ناہنجار لڑکے! گیہوں ملتی ہی کہاں ہے؟ اتنی مہنگی تو ہو گئی ہے"

"گیہوں کیوں مہنگی ہو گئی؟"

"کیونکہ رام دھنی گوالے کی گائے مر گئی ہے"

گائے کی موت کا گیہوں کی مہنگائی سے کیا تعلق ہے؟ عجیب اوٹ پٹانگ دنیا ہے۔ کل یہ لوگ کہیں گے رامو کمہار کا گدھا مر گیا ہے۔ اس لئے گھوڑے مہنگے ہو گئے ہیں یا ماسٹر صاحب رام کی نوجوان لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے اس لئے گوردھن درزی نے سلائی کے ریٹ بڑھا دئے ہیں ہمیں ایسی دنیا پر بڑا غصہ آجاتا اور ہم سوچا کرتے کہ ایسی اوٹ پٹانگ دنیا کو بدل کر رکھ دیں گے۔

مگر والدہ محترمہ نے ہمیں سمجھایا کہ جب گوالے کی گائے مر جاتی ہے تو دودھ مہنگا ہو جاتا ہے اور جب دودھ مہنگا ہوتا ہے تو گوردھن درزی کا خرچہ بڑھ جاتا ہے اور وہ سلائی کے دام بڑھا دیتا ہے اور جب رحیم بخش کسان سلائی کے دام زیادہ دیتا ہے تو وہ گیہوں کا نرخ بڑھا دیتا ہے اور جب گیہوں کا نرخ بڑھتا ہے تو ماسٹر صاحب رام اپنی نوجوان لڑکی کو خوبصورت

کپڑے سِلا کر نہیں دے سکتا اور وہ عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔
کیونکہ عاشق چھوکرا اس زمیندار کا بیٹا ہے جس کا باپ گیہوں پیدا کرتا ہے
اور مہنگے داموں بیچتا ہے اور اتنے زیادہ روپے کما لیتا ہے جس سے گاؤں
بھر کی نوجوان حسینائیں خوبصورت سلمے ستارے والے لباس پہن سکتی ہیں
اس کا لڑکا چاہے تو ان تمام حسیناؤں کو بھگا کر لے جا سکتا ہے۔
اور یہ سوچ سوچ کر ہمیں بڑا غصہ آتا اور ہم سوچا کرتے کہ جب ہم
بڑے ہوں گے تو گیہوں کے اس سارے نظام کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیں گے
وہ نظام جس میں نمبردار کی گھوڑی، کمہار کے گدھے پر دھڑلّس جماتی ہے اور
ماسٹر صاحب رام کی نوجوان لڑکی کا عشق گیہوں کی بالی کے ساتھ اٹکا ہوا ہے
میں اور ماسٹر صاحب مل کر بحرِ ہند میں گیہوں اُگایا کریں گے تاکہ اس کی نوجوان
لڑکی بھاگ نہ جایا کرے۔
غرض گیہوں کی ہم پر دھاک بھی بیٹھی ہوئی تھی اور گیہوں کے خلاف
ہم بغاوت کے پلان بھی بنایا کرتے تھے۔

جب ہم بڑے ہوئے

لیکن قسمت کا لکھا یا فطرت کی شرارت کہ ہم زیادہ دیر تک چھوٹے
نہ رہ سکے اور اچانک ایک دن معلوم ہوا کہ ہم بڑے ہو گئے ہیں اور یہ بھی
معلوم ہوا کہ ہم جھک مارا کرتے تھے اور ہمالیہ کو اٹھا کر پھینکنا تو ایک طرف
ہمارے پاس ہمالیہ تک جانے کا بھاڑا بھی نہیں ہے اور بحرِ ہند میں ہم
گیہوں نہیں اُگا سکتے کیونکہ اس سمندر میں بین الاقوامی بحری ڈاکو گھومتے ہیں
اور سمندر صرف ڈوب مرنے یا لوٹ مار کے لئے ہوتے ہیں، گیہوں اُگانے کے لئے

نہیں اور میں اور ماسٹر صاحب رام اگر دونوں مل کر بھی کوئی ایڈونچر کرنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ پٹواری کے خلاف محکمۂ مال کے افسر کے پاس ایک شکایتی درخواست دے سکتے ہیں کہ اس کی سلکی پگڑی میں کسان کا خونِ ناحق لگا ہوا ہے اور یہ درخواست اکثر داخل دفتر کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ محکمۂ مال کا افسر بھی سلکی پگڑی باندھتا ہے اور ایک سلکی پگڑی دوسری سلکی پگڑی کو سزا نہیں دے سکتی۔

اور پھر ہم نے یہ بھی معلوم کیا کہ دُنیا گیہوں کے نظام کے گرد نہیں گھومتی بلکہ زروسیم کے نظام کی غلام ہے۔ دھرتی کی کوکھ سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے گیہوں، چاول، مکی، انگور، کیلا، تانبہ، پیتل، لوہا، سونا، تیل، گنا، روئی حتیٰ کہ بینگن اور آلو، یہ سبھی چیزیں مل جل کر اس دُنیا کو گھماتی، پکراتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں ہی ہمالیہ اور بحرِ ہند اور صحرائے گوبی کی مالک ہیں اور جس کے پاس بھی یہ چیزیں ہیں وہی اس دنیا کا مالک ہے، وہی اس دنیا کو اُلّو بھی بناتا ہے اور دانش مند بھی۔ وہ اگر چاہے تو پٹواری کو موقوف کر دے یا اس کے سر پر سلکی پگڑی باندھ دے۔ اسی کے حکم سے ماسٹر صاحب رام کی نوجوان لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور اسی کے حکم سے ہماری والدہ ہمیں تھپیڑ لگاتی ہے اور باجرے کی روٹی کھلا کر ہمارا سوشل مرتبہ گرا دیتی ہے (اور من ہی من میں روتی ہے)۔

لہٰذا پہلے ان چیزوں پر قبضہ کرنا چاہیے۔

بس اسی اوٹ پٹانگ سوال کے اوٹ پٹانگ جواب پر ہمارے اوٹ پٹانگ خواب کی تعبیر کا انحصار تھا اور ہم نے اب لڑکپن کے غصیلے پن سے نہیں بلکہ بڑپن کی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا شروع کیا تو ہماری

بیوی نے آکر کہا "جہنم میں جائے تمہارا ہمالیہ اور بحر ہند۔ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ پہلے آٹے کا بندوبست کرو اس کے بعد اس دنیا کے نظام کو بدلنا۔"

اور جب ہم آٹے کا بندوبست کرنے میں مصروف تھے تو ہسپتال سے اعلان ہوا کہ "تمہارے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس کے لئے قمیص، رومال اور جوتے کا بندوبست کرو۔"

اس کے بعد ہسپتال سے پے در پے تین بار ایسے اعلان کئے گئے۔

ہم بور ہو گئے، ہم بے بس ہو گئے۔ ہم تھک ہار گئے۔ رگوں میں لہو کم ہونے لگا۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہونے لگی۔ پاؤں میں سکت گھٹنے لگی صبح سے شام اور شام سے صبح آٹے، جوتے، قمیص، کرسی، تیل، گھی کبھی کبھار دودھ وغیرہ اشیاء کا بندوبست کرتے گزرنے لگے اور کبھی کبھی صرف سرد آہ کے ساتھ، نظر جھکا کر بلکہ شرما کر ہمالیہ کی طرف بھی دیکھ لیتے جو بدستور سر غرور بلند کئے کھڑا رہتا تھا اور ہمیں طنزاً بلاوا دیا کرتا تھا "ابے لونڈے! آ ذرا مجھے اٹھا کر بحر ہند میں کیوں نہیں پھینکتے۔ میں آخر کب تک تمہارا انتظار کروں گا۔"

جب ہم سوچنے لگے

اور تب خیال آیا کہ عمر تھوڑی ہے، کام بڑا ہے اور یہ خدا کی سازش ہے کہ اس نے ہمیں بہت تھوڑی عمر عطا کی تاکہ عمر کا کچھ حصہ خواب دیکھنے میں گزر جائے۔ کچھ حصہ دال، آٹا اور جوتے کا بندوبست کرنے میں اور باقی حصہ مصنوعی دانت لگوانے، آنکھوں پر چشمہ فٹ کروانے اور کھانسی کی

گولیاں کھانے میں گزر جائے ـــــ اگر خدا چاہتا تو ہمیں موجودہ عمر سے
دس گنا زیادہ عمر دے سکتا تھا تاکہ ہم دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی اشیاء
پر قبضہ کر لیتے اور ان کی تقسیم کچھ ایسے خوبصورت ڈھنگ سے کرتے کہ
جب رام داس گوالے کی گائے مر جاتی تو گیہوں مہنگا نہ ہو جاتا اور نتھو کہار
کو بھی پگڑی مل جاتی اور کسان کا خونِ ناحق محکمۂ مال کے افسر کے حلق سے
بھی نہ اتر سکتا اور اگر اتر بھی جاتا تو اندر جا کر رگ و پے میں دھاندلی مچا
دیتا اور وہ چیختا چلاتا ہوا ماسٹر صاحب رام کے پاؤں پر آگرتا اور کہتا۔
"ماسٹر جی! آپ کی نوجوان لڑکی سے میں عشق کرتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے
اس سے عشق کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ اسے چابک سے مت ماریئے"۔

مگر پھر خیال آتا ہے۔ عمر کا بھی ایک بہانہ ہی ہے۔

تاریخ کو کھنگالا تو دیکھا کہ صرف ایک انسان نہیں بلکہ کئی انسانوں کی
کتنی عمریں اس سیم و زر کے نظام کو بدلنے پر صرف ہوتی رہیں لیکن اس نظام
کے کیریکٹر میں کوئی نقص ہے یا اس نظام کی نیت کھوٹی ہے کہ یہ بدلتا ضرور
ہے مگر چیونٹی کی سی چال کی طرح۔ اس کی رفتار اتنی مدھم ہے کہ ایک انسان
نے ستر برس کی عمر تک صرف ایک پتھر کھسکایا اور دوسرے انسان نے مزید
ستر برس لگا کر اس پتھر کو لوٹا، پھر تیسرا انسان، چوتھا، پانچواں۔ پھر تیسرا
اور چوتھا اور پانچواں پتھر، ایک نسل سے دوسری نسل تک۔ دوسری سے
تیسری، چوتھی اور پانچویں تک ـــــ بار بار اور یہ ہم اس نظام کے پتھر کو
نئی شکل و صورت دینے میں مصروف رہے۔ پتھر کے زمانے سے ہم ایٹم کے
زمانے تک آپہنچے۔ لیکن اس کے باوجود تبدیلی کا یہ عالم ہے کہ آج بھی مسلم
دنیا کا ایک مزدور چیخ اٹھتا ہے ـــ "ہمارے گھر میں پانی کا نل تک نہیں

ہے، بجلی کا ایک بلب تک نہیں، جس کی روشنی میں بیٹھ کر ہم پڑھ سکیں!
اور اس چیخ کے جواب میں پولیس لاٹھی اور گولی لے کر آجاتی ہے اور کہتی ہے ــ "خبردار! جو زیادہ بک بک کی، ورنہ نقضِ امن میں تمہیں ہتھکڑی پہنا دیں گے۔"

کیا آج بھی ہم نہیں سُنتے کہ محکمۂ مال کا فلاں افسر ایک لاکھ روپے رشوت کھا کر عیش کر رہا ہے اور ماسٹر صاحب رام شیجر گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول کی نوجوان لڑکی کو کالج میں داخلہ نہیں مل سکا، کیونکہ اس کے نمبر کم تھے اور نمبر اس لئے کم تھے کہ اسے مناسب خوراک اور مناسب لباس میسر نہیں آتا تھا ــــــ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ نوجوان لڑکی اپنے گھر سے بیزار ہو کر کسی عاشق کے ساتھ بھاگ نہ جائے۔

ہم آج بھی پٹواری کی سِلکی پگڑی پر اعتراض نہیں کر سکتے ــ کیونکہ پٹواری نے جب کسان کے خونِ ناحق سے سِلک کا تھان خریدا تھا تو آدھا تھان تحصیلدار کو بھیج دیا اور جب فکر تونسوی نے اس تحصیلدار کی شکایت کی تو ڈپٹی کمشنر نے فکر تونسوی کو یہ کہہ کر جیل بھجوا دیا کہ اس کے قبضہ سے ناجائز افیون برآمد ہوئی ہے۔

جب ہم ہنسنے لگے ــــــ

افیون ناجائز ہے، ڈپٹی کمشنر ناجائز ہے، رام داس کی گائے ناجائز ہے، ہمسائیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا ناجائز ہے، عشق ناجائز ہے، حسن ناجائز ہے۔ غرض سارے کا سارا نظام ناجائز ہے اور جائز کیا ہے؟ خاموشی سے باجرے کی روٹی کھائے جانا، لیمپ کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ

کرتے رہنا، نمبردار اور ٹھیکیدار کی گالیاں کھاتے اور سہتے رہنا تاکہ پیٹ کے اندر جو دوزخ ہے، اسے تھوڑا بہت ایندھن ملتا رہے۔ ساری دنیا اس ایندھن کی تلاش میں سرگرداں ہے کیونکہ دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی سب چیزوں پر چند اشخاص نے قبضہ کر رکھا ہے اور اس قبضے کو قانون، دھرم، کلچر اور دلیش بھگتی کے نام پر منصفانہ قرار دیا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی کوئی فکر تونسوی اس قبضے کو چیلنج کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو اس پر گیہوں کے دروازے اس لئے بند کر دیئے جاتے ہیں کہ اسے شیطان نے بہکا دیا ہے۔

گیہوں کی شیطانی، جس کے اردگرد سارا نظام گھومتا ہے۔

پیٹ، جو اس سارے نظام کو چار و ناچار قائم رکھے ہوئے ہے۔

اور مجھے اس وقت بے ساختہ ہنسی آتی ہے جب میرا بیٹا کبھی کبھی بڑے انقلابی لہجے میں بڑی اوٹ پٹانگ بات کرتے ہوئے کہتا ہے ——

"ڈیڈی! یہ کیسا نظام ہے؟ مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں اسے ہل کر رکھ دوں گا۔ میں ہمالیہ پربت کو اٹھا کر بحرِ ہند میں پھینک دوں گا اور بحرِ ہند کو خشک کر کے اس میں گیہوں اُگا دوں گا!"
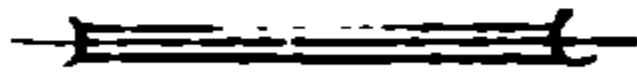
ایڈیٹر کے نام لَو لیٹرز

روزنامہ "دلیش دردہی" گذشتہ پندرہ برس سے عوام کی باؤنٹ اور بے اَونٹ دونوں قسم کی خدمت کر رہا ہے۔ ان خدمات سے متاثر ہو کر عوام اکثر و بیشتر ایڈیٹر کو اپنے لَو لیٹرز بھیجتے رہتے ہیں۔ ان لَو لیٹرز میں ایڈیٹر کے لئے تفریحِ طبع کا سامان زیادہ ہوتا ہے اِس لئے قارئین کی تفریحِ طبع کے لئے ان میں سے چند خطوط پیش کر رہا ہوں۔ ایڈیٹر سے رسمی اجازت بھی نہیں لی گئی۔ کیونکہ وہ عوام اور لَو ـــــ دونوں کے بارے میں بڑا سینیٹو (SENCITIV) ہے +

گالیاں دے کے

اَبے او ایڈیٹر کے تخم!

میرے خیال میں تو گیدڑ کی اولاد ہے! میں ہر روز تیرا اخبار پڑھ کر

اس پر تھوکتا ہوں اور پھر میونسپلٹی کے اس کوڑادان میں پھینک دیتا ہوں۔ جس میں لوگ گلے سڑے گندے چھلکے اور کنواری ماؤں کے مردہ بچے پھینکتے ہیں۔ کل تمہاری ماں چوراہے پر دوہتڑ مار مار کر سیاپہ کر رہی تھی ——— ہائے رے لوگو! مجھ ابھاگن نے ایسے ناہنجار بیٹے کو کیوں جنم دے دیا' جو اخبار کو طوائف سمجھ کر چکلے میں چلاتا ہے۔ کاش! چکلے کو جنم دینے کی بجائے میری کوکھ بانجھ ہو جاتی!

اور سن! یہ میرا چودھواں خط ہے! اگر مجھے اس کا بھی جواب نہ ملا تو میں سمجھوں گا' تیرا سینہ انسانیت کا قبرستان ہے' رذالت تجھے اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اپنے باپ کو مزید گالیوں سے بچانا چاہتے ہو تو جواب دے دو' ورنہ پندرھویں خط کا انتظار کرو! پھوں' پھاں' پھیں!

تمہارا:-

(میرا نام گذشتہ خطوط میں سے دیکھ لو)

تعریف اُس خُدا کی ———

محترم و معزز و موقر ایڈیٹر "دیش دروہی" صاحب!

آپ کے محترم و معزز و موقر اخبار کے "ہولی نمبر" کا اعلان پڑھ کر ہمارا سارا شہر پھولا نہیں سمایا۔ کیونکہ اسی اعلان پر بھروسہ کر کے سارا شہر ہولی مناتا ہے۔ اگر آپ یہ اعلان نہ کرتے تو ہولی کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ اہلِ ذوق کی متفقہ رائے ہے کہ ہولی کی شان صرف آپ کے اخبار ہی کے

دم سے قائم ہے!

جیسا کہ آپ گذشتہ کئی برسوں سے دیکھتے آرہے ہوں گے، میں صرف تہواروں ہی پر اپنی نظمیں آپ کو بھیجتی رہی ہوں۔ لوہڑی، دیوالی، دسہرہ یہاں تک کہ پندرہ اگست کو بھی ایک موسمی تہوار سمجھ کر نظم لکھ دیتی ہوں، کیونکہ تہواروں پر لکھنا میری ہابی ہے۔ گذشتہ پندرہ اگست پر میں نے جو نظم "چودہ اگست کی رات" آپ کو ارسال کی تھی۔ یاددہانی کے لئے اس کی نقل پھر بھیج رہی ہوں۔ یاد رہے کہ آپ نے یہ نظم نہیں چھاپی تھی بلکہ صرف میرا فوٹو چھاپ دیا تھا اور لکھا تھا کہ ہم اپنے اخبار میں صرف حسین چیزیں چھاپتے ہیں ——— میں آپ کے حسنِ نظر کی داد دیتی ہوں۔ اور اس بار فوٹو کے ساتھ ہولی پر نظم بھی بھیج رہی ہوں مقابلہ کڑا ہے، دیکھیں آپ کی نگاہِ انتخاب کس پر پڑتی ہے!

میں اور میری سہیلیاں نظم چھپنے کی منتظر ہیں۔

آپ کی

زینت آرائے جہاں

تیری شان جلّ جلالہٗ ———

جناب ایڈیٹر صاحب آف "دلیش درو ہی"

کوچہ دردلیشاں سے چھپنے والا!

میں ہر روز آپ کا اخبار باقاعدگی سے نتھو حلوائی کی دکان پر پڑھتا ہوں بلکہ کئی بار آپ کے ایڈیٹوریل مضامین چوری چھپے پھاڑ کر گھر بھی لے جاتا ہوں اور اپنی بیوی بچّوں کو سُناتا ہوں۔ وہ انہیں کتھا پاٹھ کی طرح

بہت عقیدت سے سنتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے (اور میرا اندازہ کبھی بدنصیبی ہی سے غلط ہوتا ہے) کہ آپ کو "دیش بدیش" کے متعلق کافی معلومات حاصل ہیں۔ براہ کرم اپنے بیش قیمت لمحات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر مجھے مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچانے کا کشٹ کریں۔

۱۔ آپ کے اخبار میں ڈینٹل کریم کا اشتہار چھپا ہے، کیا آپ نے اُسے استعمال کیا ہے؟ کیا وہ کریم عمدہ ہے؟ اگر عمدہ ہے تو آپ اس میں کتنے فی صدی رعایت دلوا سکتے ہیں؟ تھوک اور پرچون دونوں میں ——

۲۔ آپ نے پرسوں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ راجاؤں نے اپنے ہاتھیوں کو باہر نکال دیا ہے اور وہ ہاتھی یتیموں کی طرح دھکّے کھاتے پھرتے ہیں —— یہ ہاتھی کس شہر میں دھکّے کھاتے پھرتے ہیں؟ اس شہر کا نام لکھئے، مَیں ان میں سے ایک ہاتھی کو اپنے گھر لانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے یتیم پالنے کا بڑا شوق ہے!

۳۔ رشوت لینے کی سیدھی سادی تکنیک کیا ہوتی ہے؟ آپ کو تو معلوم ہی ہوگی۔ میں ایک غریب کلرک ہوں۔ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے رشوت لے کر عزّت سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

۴۔ آپ کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہوگا۔ یقیناً ہزاروں پر مشتمل ہوگا۔ کیا آپ اپنے حلقے میں سے کوئی شادی کے قابل لڑکا تلاش کرسکتے ہیں؟ لڑکا آپ کی طرح انسانیت پرست ہونا چاہیئے —— دراصل میری ایک کنواری لڑکی (عمر اٹھائیس سال) کے لئے کسی

ذبیس بتیس (پینتیس بھی بُرا نہ رہیگا) سال کے کنوارے (رنڈوا بھی بُرا نہ رہے گا) لڑکے کی ضرورت ہے ۔ لڑکی ہر لحاظ سے سوشیل ہے، صرف ایک آنکھ قدرے پتھر کی ہے ۔ اسی لئے میں انسان دوست لڑکا چاہتا ہوں ۔ کیونکہ انسان دوست حضرات صرف گن دیکھتے ہیں عیب نہیں! اور پھر بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے !

خاص نوٹ: جب تک ہاتھ لگا کر محسوس نہ کیا جائے، وہ آنکھ دُور سے پتھر کی بالکل نہیں معلوم ہوتی ۔

میرے خط میں کوئی گستاخانہ فقرہ آگیا ہو تو معاف کر دیجئے ۔ آپ اپنے بلند کیریکٹر کی طرف دیکھئے، میری طرف نہیں !

آپ کا غلام ابنِ غلام
جے ۔ ناتھ

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں ـــــــــ

ایڈیٹر جی !

یہ آپ نے کیا غضب کیا ؟ مَیں نے کل چوک مجڑ بھونجاں میں جو تقریر کی تھی، وہ تو عوام کے مفاد میں تھی ۔ لیکن آپ نے اسے یُوں توڑ مروڑ کر شائع کیا کہ وہ عوام کے لئے ضرر رساں ہو گئی ۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں اس چوک کا جُوا خانہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بند کروا دوں گا ۔ میں ایک ذمہ دار انسان یعنی ایم ۔ ایل ۔ اے ہُوں، کوئی ہٹلر یا مسولینی نہیں ہوں کہ جسے چاہوں بند کر دوں، جسے چاہوں رہا کر دوں ـــــــ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ یہ جُوا خانہ بند ہو جائے یا

کھلار ہے، تو بھی دیش کی ترقی جاری رہے گی ـــــــ بڑے سے بڑا ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ بھی اس ترقی کو نہیں روک سکتا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کتنا بیّن فرق ہے دونوں میں۔ میری حقیقی تقریر میں پوری جمہوری سپرٹ قائم تھی۔ لیکن توڑ مروڑ کر چھپنے سے عوام میں میرا سارا امیج (IMAGE) برباد ہوگیا۔ حلقے بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہا۔ بالخصوص جوئے خانے کے مالک شری بھاسے شاہ جی نے اس کا بہت برا اثر لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس کے برا ماننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرے ووٹروں کو حق ہے کہ وہ کسی بھی بات پر برا مانیں۔ جوئے خانے برے نہیں ہوتے۔ صرف ان کے پیچھے جو نیت ہوتی ہے۔ وہ بری ہوتی ہے، اور پھر جوئے خانے جبر و استبداد سے نہیں، تہذیب اور شرافت سے بند ہونے چاہئیں۔ آپ سمجھ گئے میرا یہ جمہوری نکتہ؟

براہِ کرم اس کی تردید شائع کرکے میرے مجروح ووٹروں پر پھاہا رکھ دیجئے۔ میں جانتا ہوں یہ حماقت آپ کی نہیں ہوسکتی۔ آپ کے کسی رپورٹر کی ہے۔ نہ جانے اُسے مجھ سے کیا بغض ہے؟

گذارش: کسی دن غریب خانے کا ڈنر قبول فرماکر تشریف لائیے نا! اپنے اس رپورٹر کو بھی ساتھ لائیے گا۔ میرے پاس سکم سے شاہی رم کا سٹاک آیا ہوا ہے۔

پچیس سالہ عوامی خدمتگار

رام رام بھروسے

جُگ جُگ جیو میرے ... ـــــــــ

قابلِ عزت ایڈیٹر صاحب بہادر! ـــــ خدا آپ کو مرنے سے

پہلے اور مرنے کے بعد دونوں وقت جنت نصیب کرے۔ کیونکہ ہم نے آپ کے مقبول عوام و خواص اخبار میں خداوند تعالیٰ کے بھروسے پر اپنی فرم کی تیار کردہ دوائی "مردانہ قوت" کا اشتہار دیا تھا۔ اس کا آپ کے قارئین نے ایسا شاندار استقبال کیا کہ پہلے ہی مہینے میں ہمیں دو ہزار روپے کے آرڈر موصول ہو گئے! نہ جانے آگے آگے کیا ہوگا؟ ——— یہ کامیابی "مردانہ قوت" کی نہیں ہے آپ کے اخبار کی ہے!

اس کامیابی سے مسرور ہو کر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اشتہار کے لئے دگنی جگہ مخصوص کر دی جائے۔ تاکہ آپ کو اور ہمیں، دونوں کو عوام کی نوازشوں سے فائدہ ہو ——— اس کے علاوہ فرم کی طرف سے آپ کو ایک شایانِ شان عشائیہ دیا جائے۔ تحریر فرمائیے کہ آپ کس دن اور کس وقت عشائیے کی شان میں اضافہ کر سکتے ہیں؟

ایک پیکیٹ "مردانہ قوت" بطور تحفۂ درویش علیحدہ ڈاک سے ارسال کیا جا رہا ہے۔ نتائج سے آگاہ کیجئے اور اس کے بعد ایک سرٹیفکیٹ سے ممنون فرمائیے!

آپ کا احسان شناس:
حکیم اللہ رکھا حاذق

ڈھونڈ اب مجھ کو ———

ایڈیٹر "دلیش درویی" (کتنا واہیات نام ہے) جی!

میں آپ کے اخبار کو معیاری سمجھ کر اپنی تخلیقات ارسال کرتا رہا۔ لیکن یہ میری جہالت تھی۔ کیونکہ میری تخلیقات معیاری تھیں، آپ کا اخبار نہیں۔

(اس غلطی کی تصحیح کر لیجئے۔ میں نے کر لی ہے)۔

پہلے میں نے کہانیاں بھیجیں۔ ہر کہانی آپ نے ایک چھپی ہوئی سلپ چسپاں کر کے لوٹا دی کہ بوجوہ ہم اسے شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ وجوہ میں سمجھ گیا کہ کہانیاں گہری اور سمبالک تھیں۔ اس لئے آپ کی ناقص سمجھ میں نہ آئی ہونگی اس لئے میں نے سیدھی سادی نظمیں بھیجیں۔ لیکن آپ نے ان کی تقدیر میں بھی وہی منحوس سلپ اٹکا دی۔ پھر ڈرامے ——— ؟ پھوں! انشائیے ... پھال. تنقید..... آہ آہ!

لیکن آپ کے پاس صرف وہی سلپیں تھیں، معیار نہ تھا۔ اس کے باوجود آپ کی سوجھ بوجھ کا الیوژن مجھ میں زندہ رہا اور میں ابھی اپنا بیش قیمت ناول بھیجنا چاہتا تھا کہ گذشتہ ہفتے کے "ویلش ورد ہی" میں کسی زخمی نامراد آبادی کی نظم "گائے کا گوبر" شاعر اور گائے دونوں کی شاندار تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ کہ اوہو! ان کا معیار تو گوبر سے آگے نہیں بڑھ پایا! اور شکر ہے پاک پروردگار کا کہ میں آپ کے اخبار میں چھپنے سے بال بال بچ گیا!

یہ خط صرف اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے تحریر کر دیا ہے۔ ورنہ یہ میرا آخری خط ہے۔ میری طرف سے کسی مزید خط یا تخلیق کی توقع نہ کریں بلکہ

شعر

ڈھونڈ اب مجھ کو چراغِ رخِ زیبا لے کر!

آپ کا میعاری دشمن

پٹاخہ انگاروی

مفت ہوئے بدنام

دفتر دربھاگیہ سنگھ صاحب، چیف منسٹر درلبھ سٹیٹ

مسٹر ایڈیٹر!

ہمارے آنریبل چیف منسٹر نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو یہ ارجنٹ لیٹر لکھ دوں۔ کیونکہ وہ بواسیر کی نئی ایجاد کردہ دوائی کے اُدگھاٹن کے لئے ایک ہل اسٹیشن پر تشریف لے گئے ہیں اور ایک ہفتہ تک اس سرکاری اُدگھاٹن میں مصروف رہیں گے۔

آپ کے اخبار میں ایک کہانی شائع ہوئی ہے جس کے ہیرو کا حُلیہ اور حرکات و سکنات یہاں تک کہ کھانسی تک چیف منسٹر شری دربھاگیہ سنگھ جی سے ملتی ہے۔ کہانی میں ایک محبوبہ بھی سانس لیتی ہے۔ لیکن صرف کہانی میں سانس لیتی ہے۔ چیف منسٹر صاحب کی زندگی میں میلوں تک اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کا عشق نہایت دلگر قسم کا ہے۔ اس عشق میں چیف منسٹر کا سا وقار ہے نہ تمکنت۔ یہ کہانی پڑھ کر سٹیٹ کے عوام چیف منسٹر صاحب سے سخت مشتعل ہو گئے ہیں اور چیف منسٹر صاحب جواباً آپ پر مشتعل ہو رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو مسٹر ایڈیٹر! ماشاءاللہ خرید لیا گیا ہے اور یا پھر مسٹر ایڈیٹر! آپ انھیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بھی آپ کو خرید لیں ــــــ بہرکیف دونوں میں سے جو پوزیشن نیچرل ہو، آنریبل چیف منسٹر کو آگاہ کریں تاکہ آپ کے حق میں یا خلاف مناسب جمہوری کارروائی کی جاسکے۔

نوٹ: آنریبل چیف منسٹر آپ کا اخبار نہیں پڑھتے۔ کیونکہ انھیں عوام کی خدمت ہی سے فرصت نہیں ملتی لیکن بدقسمتی سے آپ کا اخبار

عوام پڑھتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام کے اشتعال کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔
ڈوسرا نوٹ :۔ کیا یہ بہتر نہ رہے گا کہ آپ اس کہانی کی تردید شائع کردیں۔ تاکہ آپ آنریبل چیف منسٹر کا اور وہ عوام کو منہ دکھانے کے قابل ہو سکیں!

آپ کا
جے۔ بھگوڑا۔ پرسنل اسسٹنٹ

کھُل گئی تیری حقیقت

ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر صاحب "دلیش درو ہی"!
دو ہفتے ہوئے، میں نے آپ کے اخبار میں اشتہار چھپوایا تھا کہ میری آدھی بھوری اور آدھی کالی بھینس چوری ہو گئی ہے (اشتہار کا بل ادا کر چکا ہوں)۔ آپ ہمیشہ بکتے ہیں کہ "دلیش درو ہی" ہی اشتہار دے کر فائدہ اٹھائیں۔ مگر مجھے تو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا۔ بھینس تو ملی نہیں۔ اُلٹے میرا خاندانی گدھا بھی رسہ تڑا کر کہیں بھاگ گیا۔
میں سمجھتا رہا، یہ اخبار کا نہیں، میری تقدیر کا قصور ہے لیکن کل میرے خالہ زاد بھائی نے انکشاف کیا کہ "درویش درو ہی" تو ایک فراڈ اخبار ہے۔ اس میں بال کالے کرنے والے تیل کا ایک اشتہار چھپتا ہے جس میں ایک ڈپٹی منسٹر کا تعریفی سرٹیفکیٹ بھی شامل ہوتا ہے۔ تیل منگوانے پر بال کالے تو کیا ہوتے سر کے بچے کھچے بال بھی جھڑ گئے ——— اسی طرح ہماری گوجر برادری کے ایک اور بھائی نے بتلایا کہ ہم ایک اشتہار "کنیا کے لئے ور کی ضرورت ہے" پڑھ کر جب کنیا سے ملے تو معلوم ہوا، وہ بھینگی ہے!"

اب ہماری برادری کی جنرل باڈی میٹنگ نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ میری بھینس والے اشتہار کی رقم پینتالیس روپے ساٹھ پیسے نہیں لوٹائیں گے، ہم اخبار کا بائیکاٹ کر دیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہماری برادری معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ گذشتہ تین نسلوں ہی سے آپ کا اخبار پڑھتی چلی آ رہی ہے!

افسوس، اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ کا اخبار بھینسیں بھی نہیں پڑھتیں تو ہم تین نسلوں تک گمراہ نہ رہتے! شکر ہے کہ ہماری گم شدہ بھینس نے ہمیں راہِ راست دکھا دیا۔

آپ کا
گھاسی رام جنتا ملک ڈیری

توہین! — توہین! — توہین! —————

ایڈیٹر روزنامہ دیش دردہی"!

ہرگاہ کہ میرے موکل سیٹھ دولت رام مفلوک کے متعلق آپ نے ایک خبر شائع کی ہے جو بادی النظر میں توہین آمیز معلوم ہوتی ہے کہ انھیں سرکاری اعزاز "چمکیلا ستارہ" کیوں عطا کیا گیا ہے جبکہ وہ اتنا غیر مہذب ہے کہ تمباکو والا پان کھاتا ہے اور جگہ جگہ تھوکتا پھرتا ہے۔

پان ہماری تہذیب کا گل رنگ ورثہ ہے اور کانسٹی ٹیوشن میں تمباکو کھانے کی بھی ممانعت نہیں ہے ——— اس کے علاوہ آپ نے مفلوک صاحب کی شاعری کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ ہلدی کے اس بیوپاری کے شعروں سے ہلدی کی باس آتی ہے۔ ان دونوں الزامات سے میرے معزز موکل کی ادبی

اور تجارتی یہاں تک کہ سوشل مرتبے کو بھی سخت ٹھیس پہنچی ہے اور عوام میں ان کی جائز مقبولیت ناجائز ہو گئی ہے!

میرے موکل (معزز موکل) نے مجھے ہدایت کی ہے کہ یا تو آپ اپنے اخبار میں پورے صفحے پر دست بستہ معذرت طلب کریں ورنہ آپ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا کیس تیار کیا جائے۔ معذرت میں سیٹھ صاحب کا فوٹو بھی شائع کیا جائے جس میں آپ اپنے فوٹو میں دست بستہ معافی مانگتے ہوئے نظر آئیں ———

معذرت طلبی کے لئے آپ کو پندرہ دن کی مہلت دی جاتی ہے اور اگر ان پندرہ دنوں میں میرے موکل کے دل پر توہین کا شدید دورہ پڑ گیا تو اس کے میڈیکل ہرجے خرچے کی ذمہ داری آپ پر ہوگی!

آپ کا

بانکے لال نڈر۔ ایڈوکیٹ (لائسنس یافتہ)
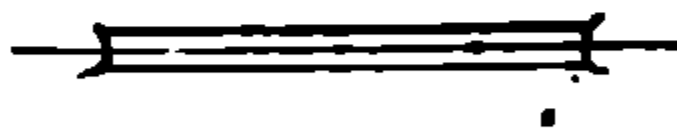
میری وصیّت

میں یہ وصیت نامہ اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ میرے بعد میری جائداد پر جو
ڈیڑھ کمرے کے مکان پر مشتمل ہے جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے اور میرے وارث ایک
دوسرے کا خون نہ کر ڈالیں۔ کیونکہ گزشتہ دنوں ہمارے محلّے کے ایک بھائی
نے دوسرے بھائی کا ایک گھٹنا اور ایک ٹانگ اس بات پر توڑ دی تھی کہ ان کا
مرحوم باپ اپنے پیچھے جو اینٹیں چھوڑ گیا تھا، ان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا تھا۔
ایک بھائی نے ایک اینٹ زیادہ اٹھالی تھی۔ اینٹ کا سائز چھ انچ ضرب
دس انچ بتایا جاتا ہے۔

مَیں یہ وصیت پیشگی لکھ رہا ہوں کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں کب مرُونگا
مختلف جیوتشیوں نے میری عمر مختلف بتائی ہے۔ ایک نے پچاس سال، ایک
نے پچھتّر اور ایک نے نوّے، یہ تینوں اندازے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔
کیونکہ آجکل کے جیوتشی مختلف پبلشروں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ میری عُمر اِس

وقت اڑتالیس سال ہے۔ عین ممکن ہے میں ایک ، سو اڑتالیس سال تک بھی زندہ رہوں۔ کیونکہ سُنا ہے کئی بوڑھے بڑی بڑی لمبی عمر تک جیتے رہتے ہیں اتنی لمبی عمر تک زندہ رہنے کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک صبح کی سیر کا لُطف اٹھاتے رہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی خبر اخباروں میں شائع ہو سکے کہ فلاں صاحب ایک سو اڑتالیس سال کی عمر کے ہیں لیکن ابھی زندہ ہیں (نہ جانے ان کے زندہ رہتے چلے جانے کی وجہ کیا ہے ؟)۔

بہرکیف عین ممکن ہے، صرف اخبار میں خبر چھپوانے کی خاطر مجھے بھی ایک سو اڑتالیس سال تک زندہ رہنے کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے، خواہش نہیں ہے!

میرے گھر کے چھ افراد ہیں (ساتواں زیرِ تعمیر ہے)۔ میں نے زندگی میں جو کچھ کمایا ہے، یہ افراد اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر کھا گئے۔ میرا بڑا لڑکا جب خود کمانے لگا تو مجھے گالیاں وغیرہ دے کر مجھ سے الگ ہو گیا۔

چند سال پہلے ایک بیمہ ایجنٹ نے مجھے موت کا ہوّا دکھا کر گمراہ کر دیا تھا اور میں نے دو ہزار روپے کا بیمہ کروا لیا تھا۔ دو سال تک قسطیں ادا کرتا رہا۔ (اس دوران میں وہ بیمہ ایجنٹ خود مر گیا) اچانک ایک دن میں اپنے دو چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر راہِ راست پر آ گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"پپّو! ڈیڈی نے بیمہ کیوں کروا رکھا ہے ؟"

"ہمارے لئے"

"ہمارے لئے کیسے ؟"

"دیکھ بے وقوف! جب ڈیڈی مر جائیں گے تو یہ دو ہزار روپے ہمیں مل

جائیں گے!"

"نہ جانے ڈیڈی کب مریں گے ؟"

"جب بھگوان چاہیں گے!"

"نہ جانے بھگوان کب چاہے گا!" (ٹھنڈی آہ!)

اور میں راہِ راست پر آ گیا اور بیمے کی مزید قسطیں دینا بند کر دیں۔ کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ بھگوان ننھے بچّوں کی دعائیں جلد قبول کر لیتا ہے ......

اس لئے میں وصیّت کرتا ہوں کہ اگر میری موت کے بعد بیمہ کمپنی میری جمع شدہ قسطیں واپس کر دے تو وہ روپے میرے بچّوں کو نہ دئے جائیں بلکہ کسی یتیم خانے کو دئے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد میرے بچے بھی یتیم کہلائیں گے لیکن موت کے بعد میرے لئے سبھی یتیم بچے برابر ہیں۔

میرا جو ڈیڑھ کمرے کا مکان ہے۔ اسے میرے گھر کے چھ افراد میں تقسیم کر دیا جائے۔ احتیاطاً عرض ہے کہ میں نے یہ مکان بھارت سُدھار فنانس کمپنی سے قرض لے کر خریدا تھا اور میرے گھر والے نہیں جانتے کہ میں نے قرض کی قسطیں کن کن خفیہ طریقوں سے ادا کیں۔ مثلاً میں نے بچّوں کی نیکروں میں سے کپڑا بچایا۔ انہیں بوٹ دے دیئے جرابیں بچالیں، ایک بار میں نے اپنے چھوٹے بچے سنتوش کو چھوٹے سائز کی سلیٹ خرید کر دی یعنی سائز بچایا۔ میں نے بچوں کے دودھ میں پانی ملا کر انہیں بتایا کہ پتلا دودھ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ میں نے تین تین بچّوں کو ایک چارپائی پر سلا کر ان میں برادرانہ اخوت پیدا کی کانچ کی چوڑیاں پہنا کر میں نے بیوی کو زیادہ رومانٹک اور دلکش کہا اور اپنی تین چوتھائی عمر بیوی کو یہ سمجھانے پر صرف کی کہ تم چاند کی طرح حسین ہو۔ کیونکہ چاند گہنے اور ساڑیاں نہیں پہنتا۔

یعنی اس طرح میں نے قرض کی قسطیں ادا کیں اور یہ باتیں میرے گھر میں کسی کو معلوم نہیں۔ اگر میں اپنا غم نہ چھپاتا تو گھر والے کبھی خوش نہ ہوتے اور یہی میری ذہانت تھی۔ انسان غریب ہو تو ذہین ہو جاتا ہے۔ اور صرف ذہانت ہی نے غریبی کا ساتھ دیا ہے۔ فنانس کمپنیوں نے نہیں!

لیکن میری ذہانت کے باوجود فنانس کمپنیوں کی دو قسطیں ابھی تک باقی ہیں اس لئے قانونی طور پر کمپنی ہی اس مکان کی مالک ہے۔ اگر میرے وارث میری دو قسطیں ادا نہ کر سکیں تو بلا شبہ اسے قرق ہونے دیں۔ میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے اخلاق کو بلند دیکھنا چاہتا ہوں۔

میرے بعد میرے بچوں کو کیا مستقبل ہو گا؟ میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتا کیونکہ میری تھیوری یہ ہے کہ ہر بچہ اپنا مستقبل خود بناتا ہے"۔ والدین تو بیچ کی کڑی ہیں جسے ہر بچہ آسانی سے توڑ دیتا ہے اور توڑنے کے بعد کوئی خوانچہ لگا لیتا ہے، کوئی کلرک بن جاتا ہے، کوئی بیرسٹر، کوئی غنڈہ اور کوئی تھانیدار... کبھی کبھی کسی خوانچہ فروش کا بچہ وزیر بھی بن جاتا ہے اور اس وزیر کا بچہ جیب کاٹتے ہوئے بھی پکڑا جاتا ہے۔

اس لئے بچوں کے بارے میں باپ کو وصیت کرنے کا کوئی حق نہیں البتہ فرداً فرداً میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا لڑکا پاشی تو فلم ایکٹر بننے کے لئے بھاگ جائے گا۔ آج کل وہ مقامی سینما میں بلیک کی ٹکٹیں بیچتا ہے۔ دوسرا لڑکا رام کمار کوئی نہ کوئی مٹھ چلائے گا۔ اگرچہ اس بے چارے کو ابھی یہ علم نہیں کہ اس کے اندر دھرم کے نام پر لوٹ مچانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

آج کل وہ ایک دیوی کا بھگت ہے جو ہزاروں کماتی ہے۔ رام کمار بھی ہزاروں کمائے گا۔ گرو بن کر کار پر چڑھے گا۔ کوٹھی میں رہے گا۔ بڑے

بڑے انڈسٹریلسٹ اس کے میلے پاؤں دھوئیں گے۔ حسینائیں اس کے اردگرد رقص کریں گی اور رام کمار انھیں بتائے گا کہ یہ رقص، یہ خوشبوئیں آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہیں۔

اور اگر رام کمار یہ سب کچھ نہ کرے گا۔ یعنی وہ ذرا سا بھی چوک گیا تو گنگا میں جاکر چھلانگ لگا دے گا کیونکہ آتم ہتیا بھی آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہے۔ تیسرا لڑکا بھولے ناتھ چپڑاسی، قلی، بس کنڈکٹر، ورڈ ڈویژن کلرک، ان میں سے کوئی بھی عہدہ پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر سماج نے اسے ان میں سے کوئی چیز حاصل نہ کرنے دی تو وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائے گا، یا شاعر بن جائے گا۔ بھولے ناتھ بنیادی طور پر نیک اور مخلص آدمی ہے۔ اس لئے اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کلرک بن جائے، پھر شادی کرے، پھر بچے پیدا کرے، جیسا کہ ہر بے بس گرہستی میں رواج چلا آرہا ہے۔ البتہ وہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کلرکی کے ساتھ ساتھ کسی سیاسی پارٹی کا صدر بھی بن جائے اور شاعری وغیرہ بھی کرتا رہے تو کوئی ہرج نہیں ۔۔۔ سوسائٹی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

میری دو لڑکیاں بھی ہیں، جنھیں میں لڑکوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بڑی لڑکی بالا عمر اٹھائیس سال ابھی تک کنواری بیٹھی ہے، وہ دوشیزگی میں بھی بیوہ سی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے دوشیزگی اور بیوگی کی درمیانی منزل خواب ہی خواب میں پار کرلی ہے۔ میں نے کئی بار جان بوجھ کر آنکھیں بند کیں تاکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے، وہ نہیں بھاگی، شاید اس کا خیال ہے کہ عزت دار خاندانوں کی لڑکیاں کسی سے پیار نہیں کرتیں بلکہ پیار اور شادی کے مراحل خواب میں طے کرنے کے بعد جوگن بن جاتی ہیں

یا سماج سُدھار کا کام کرنے لگتی ہیں ۔

بہرکیف بالا کا مستقبل طے شدہ ہے یعنی بیوگی اور سماج سدھار۔ جب اپنا سُدھار نہ ہو سکے تو سماج ہی کا سدھار کرنا پڑتا ہے ۔

دوسری لڑکی ونمالا ہے ۔ (عمر اکیس سال) اگر اس کی زندگی میں کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہوگیا تو وہ اپنی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلے گی گزشتہ دو برس سے وہ اکثر خاموش رہنے لگی ہے ۔ یہ خاموشی خطرناک ہے ۔ مجھے شک ہے کہ وہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے ۔ کاش میں جلدی انتقال کر جاؤں، تاکہ اس کی خاموشی کے طوفان کو کنارے توڑنے کا موقع مل سکے ۔

مجھے اس سے سچ مچ بڑی محبت ہے ۔ میں نہیں چاہتا کہ پیار یا شادی سے پہلے اس پر بھی بیوگی کا زمانہ آجائے بیوگی سے پہلے کم از کم شادی شدہ تو ہونا ہی چاہیئے ۔ شادی نہ سہی، پیار ہی سہی !

ونمالا کا خاموش طوفان اگر میری موت تک زندہ رہ سکا تو میری وصیت ہے کہ وہ ضرور کنارے توڑے ۔ اس سے میری تمنا کو تسکین ملے گی ۔ سماج سُدھار کے لئے میں صرف ایک لڑکی بھینٹ کر سکتا ہوں ۔ دونوں نہیں !

میرے خاندان کی سب سے بڑی سمسیا میری بیوی ہے، وہ ساری زندگی میرے ساتھ محبت اور نفرت کے درمیان لٹکتی رہی ہے ۔ میرے بعد وہ دہاڑیں مار مار کر روئے گی کہ میرے سر سے سایہ اُٹھ گیا حالانکہ میں اس کے سر پہ ہمیشہ چلچلاتی دھوپ کی طرح پھیلا رہا ۔ وہ میرے سر پر بجلی کی طرح کڑکتی رہی ۔

میرے بعد دھوپ اور بجلی دونوں کا رول ختم ہو جائے گا اور گہرا بھیانک اندھیرا چھا جائے گا ۔ اُسی اندھیرے سے بچنے کے لئے وہ یہی کہا کرتی ہے کہ "اے بھگوان ! مجھے میرے پتی دیو سے پہلے اس دنیا سے اٹھا لے" ۔ اگر

بھگوان ایسا نہ کر سکا تو مجبوراً میرے بعد وہی میری جان نشین ہوگی - وہ ایک دلیر عورت ہے - لیکن صرف میرے جیسے بزدل کے سامنے جب بزدل درمیان سے نکل گیا تو اس کی دلیری بیکار ہو جائے گی - میرا خیال ہے کہ میرے بعد وہ خاندان کے شیرازہ کو بکھرنے سے روک نہ سکے گی - اس لئے مناسب یہی ہے کہ جب شیرازہ بکھر جائے تو وہ کسی ودھوا آشرم میں داخل ہو جائے - کیوں کہ ہر ہندوستانی عورت کی دو منزلیں ہیں - گرہستی اور ودھوا آشرم درمیان کی سبھی منزلیں دھوکا ہیں، فریب ہیں، چھلاوا ہیں -

ان کے علاوہ میں اپنے پیچھے کچھ دشمن چھوڑے جا رہا ہوں - یہ سبھی دشمن کبھی میرے دوست تھے جب ایک ایک کرکے میرے دشمن بن گئے تو میں نے مزید دوست بنانا چھوڑ دئے - اس لئے اس وقت میرا کوئی دوست نہیں ہے اور بغیر دوست کے مر جانے میں مجھے بہت راحت مل رہی ہے - مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا کوئی دوست میرے بچوں سے ہمدردی کرنے نہ آئے گا، صرف دشمن ہی آئیں گے جو کہیں گے، اب مرحوم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں رہی -

میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کے ساتھ نیکیاں کیں جن کا اعتراف زندگی میں کسی نے نہیں کیا - لیکن اب وہ انھیں اپنے دماغ کے قبرستان میں سے کھود کھود کر نکالیں گے اور کہیں گے ..... " مرحوم عظیم تھا، نیک تھا جس کا پھل اسے ضرور ملے گا آہ! اسے کچھ مزید نیکیاں کرنے کا موقع نہیں ملا - ورنہ وہ اور نیکیاں بھی کرتا "

میں نے کچھ لوگوں سے برائیاں بھی کی ہیں جنھیں لوگوں نے میری زندگی میں ہمیشہ یاد رکھا ہے - لیکن میرے مرنے کے بعد وہ انھیں بھول جانے کی کوشش کریں گے - یہ ان کے اخلاق کی بلندی ہوگی، اخلاق ہمیشہ

موت کے بعد بلند ہوتا ہے ۔ لیکن انھیں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ انھوں نے بھی مجھ سے کافی بُرائیاں کی ہیں ۔ اس لئے بُرائیوں کا حساب کتاب برابر سمجھا جائے اور اس سلسلے میں مزید تحقیقات بند کر دی جائے ۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ میں نے نسبتاً کم بُرائیاں کی ہیں ۔

میرے گھر میں کچھ فرنیچر ہے، کچھ برتن ہیں، کچھ کپڑے ہیں جنھیں میرے گھر والے آپس میں تقسیم کریں یا نہ کریں ۔ ایک ایک کرسی اور ایک ایک گلاس پر ایک دوسرے کے گھٹنے توڑیں یا نہ توڑیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سب چیزیں مائع ہیں، گلاس بھی، گھٹنا بھی ۔ اس لئے مائع کی خاطر مائع کو توڑنا بے وقوفی ہے ۔

اس کے علاوہ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں ۔ ان میں اکثر مانگے کی ہیں ۔ کچھ چرائی ہوئی ہیں ۔ وہ کسی لائبریری کو دان کر دی جائیں ۔ کچھ خطوط ہیں، جن میں کچھ ان دوستوں کے ہیں جو انھوں نے دشمن بننے سے پہلے لکھے تھے کچھ رشتے داروں کے ہیں، جو زندگی میں بھی بے معنی تھے اور مرنے کے بعد بھی بے معنی ہوں گے اور کچھ خطوط وہ ہیں جو میری محبوبہ نے مجھے لکھے تھے ۔ دنیا کے ہر انسان کے پاس کم یا زیادہ ایسے پریم پتر ضرور ہوتے ہیں لیکن میری محبوبہ اب ایک شادی شدہ معزز خاتون ہے ۔ اس لئے میرے وارث ان خطوط سے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن موت سے ایک دن پہلے میں ان محبت ناموں کو تلف کر دوں گا ۔ میں اپنی محبوبہ کو بھی وصیت کروں گا کہ اگر اس کے پاس بھی میرے کچھ خطوط ہوں تو انھیں تلف کر دے ۔ رُسوا ہونے یا کرنے کا کیا فائدہ ؟ ــــــ رُسوائی صرف زندہ انسانوں کے لئے مناسب ہے !

اپنا وصیّت نامہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے وارثوں کو ایک ضروری اطّلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک جیوتشی پنڈت رگھو بر دیال شاستری نے کہا تھا۔ تیری موت کسی اُونچی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیئے کہ اس جیوتشی کو پکڑ کر اسے کسی اونچی جگہ سے گرا دیں، تاکہ اس کا جیوتش اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہوا تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے!!
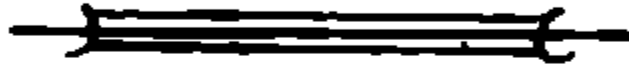
فکر تونسوی بھیڑ کا آدمی!

مجتبیٰ حسین نے لکھا

گذشتہ دس برسوں میں ملک نے کتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج سے دس برس پہلے میں فکر تونسوی کا ایک ادنیٰ سا مداح اور پرستار تھا اور آج دس برس بعد میں ان کا خاکہ لکھ رہا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ یہ فکر تونسوی کا زوال ہے مگر میں زوال کی نہیں ترقی کی بات کر رہا ہوں۔

دس بارہ سال پہلے میں 'ملاپ' میں فکر تونسوی کا کالم "پیاز کے چھلکے" کچھ ایسی پابندی سے پڑھا کرتا تھا جیسے کوئی بھگت پابندی سے گیتا کا پاٹھ کرتا ہے۔ محض "پیاز کے چھلکے" کی خاطر میں ملاپ کی سالم کاپی یوں خریدا کرتا تھا جیسے کسی دوشیزہ کے گال پر خوشنما سیاہ تل" کو دیکھ کر بعض ناعاقبت اندیش نوجوان "سالم دوشیزہ" سے شادی کر لیتے ہیں۔ فکر تونسوی آج بھی میرے لئے ادب کے گال پر "سیاہ تل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگست ۱۹۶۶ء میں مجھے دہلی جانے کا موقع ملا جس دن دہلی پہنچا اس شام کو کناٹ پلیس کے 'ٹی ہاوس' میں یونہی چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ چائے پی ہی رہا تھا کہ سامنے والی میز پر مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جو "HUNCH BACK OF NOTRE DAM" سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔ جب دل ہی دل میں قدرت کی ستم ظریفی پر ہنستا رہا کہ وہ کیسی کیسی صورتیں بنا کر دنیا میں چھوڑ دیتی ہے۔ ابھی میں اس شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک یہ احساس ہوا کہ میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ پھر سوچا کہ "ہنچ بیک آف ناٹرے ڈیم" کو چونکہ میں پڑھ چکا ہوں، شاید اسی ناول میں میں نے اسے دیکھا ہو۔ کبھی کبھی ادب بھی تو زندگی سے قریب ہو جاتا ہے۔ میں دماغ پر زور دے ہی رہا تھا کہ مجھے اچانک کسی رسالہ میں چھپی ہوئی فکر تونسوی

کی تصویر یاد آ گئی۔ اس شخص کا حلیہ فکر تونسوی کے حلیہ سے بہت ملتا جلتا تھا (بشرطیکہ اسے حلیہ کہا جا سکے)۔ فکر تونسوی کے حلیہ کی بابت یہ عرض کر دوں کہ ان کے چہرے پر دو آنکھیں ایک ناک ہے، تھوڑی بہت پیشانی بھی ہے گال بھی بقدر ظرف موجود ہیں (کسی زمانہ میں ان پر گوشت و پوست بھی رہا ہوگا)۔ غور سے دیکھا جائے تو ہونٹ بھی نظر آ جاتے ہیں ان ساری باتوں کے باوجود ان کے حلیہ کی خوبی یہ ہے کہ ان پر آدمی ہونے کی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ ان کے حلیہ میں اگر کوئی نمایاں شے ہے تو وہ ان کا "قلم" ہے۔ فکر تونسوی اس وقت تک خوبرو نظر نہیں آتے جب تک کہ ان کے حلیہ میں ان کے قلم کو بھی شامل نہ کر دیا جائے (عرف عام میں اسے ملاوٹ بھی کہتے ہیں)۔

بہر حال جب مجھے گمان ہوا کہ یہ شخص فکر تونسوی بھی ہو سکتا ہے تو میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ بڑے ہی نرم لہجہ میں پوچھا ——— "کیا آپ فکر تونسوی ہیں؟"

وہ شخص نہایت کرخت پنجابی لہجہ میں بولا ——— "ہاں جی!"

بس پھر کیا تھا میں اپنا تعارف کرائے بغیر ان سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو فکر تونسوی نے کسی قدر شرماتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کی تعریف ———؟"

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے کہا — "اوہو! معاف کیجئے! میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں"۔ یہ سنتے ہی فکر تونسوی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "پہلی بار تم بغلگیر ہوئے تھے اب مجھے بغلگیر ہونے کا موقع دو۔ بغلگیری دو طرفہ ہونی چاہیئے، یکطرفہ نہیں!" اس دن کے بعد سے آج تک یہ "بغلگیری" جوں کی توں برقرار ہے۔

فکر تونسوی کئی باتوں کی وجہ سے میری کمزوری ایسے ہیں۔ ادیب کی حیثیت سے میں انھیں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مضامین

لکھتے ہیں۔ ادب میں آج تک کسی نے اس طرح مضامین لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ہر گواہ یہ کہتا ہے کہ "میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی کہونگا سچ کہونگا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں کہونگا" اسی طرح فکر تونسوی اپنا ہر مضمون لکھنے سے پہلے اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ "جو کچھ بھی لکھونگا وہ سچ لکھونگا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں لکھونگا" گذشتہ پندرہ برسوں میں میں نے فکر تونسوی کے بیشمار مضامین پڑھے ہیں اور ان مضامین میں مجھے ایک ہی چیز نظر آئی اور وہ یہ "سچ" !

جہاں تک فکر تونسوی کے لکھنے کی رفتار کا تعلق ہے بعض احباب کا خیال ہے کہ آواز کی رفتار اور ان کے لکھنے کی رفتار میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحے لکھ ڈالے۔ ملاپ کا روزانہ کالم تو یہ لکھتے ہی ہیں بیسیوں رسالوں کے لئے مضامین لکھتے ہیں، دوستوں کو خطوط لکھتے ہیں، گھر میں دھوبی کا حساب لکھتے ہیں۔ بچوں کی تعلیمی فیس اور گھر کے اخراجات کا حساب لکھتے ہیں۔ غرض وہ کیا نہیں لکھتے۔ وہ ان ادیبوں میں سے ہیں جو لکھنے پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ ایک کافی ہاؤس ہی ایسی جگہ ہے جہاں میں نے انھیں لکھتے ہوئے نہیں پایا۔

اس سیدھے سادے اور عملی زندگی میں بڑی حد تک معصوم آدمی کو جب بھی دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر اس شخص میں اتنا STAMINA کہاں سے آگیا کہ برسوں سے لکھ رہا ہے مگر پھر بھی "خرچ" ہونے میں نہیں آتا۔ اس شخص کی ذات میں آخر طنز کے کتنے سر چشمے ہیں جو بس اُبلتے ہی رہتے ہیں کبھی سوکھنے کا نام نہیں لیتے۔ جو ادیب "روزانہ کالم نگاری" کی اذیت سے دو چار ہو چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا پیشہ ہے۔ اچھے اچھوں کا کلیجہ مُنہ

کو آجاتا ہے مگر فکر تونسوی ہیں کہ پندرہ برسوں سے مسلسل لکھتے چلے جارہے ہیں اور ہر بار نئی چیز لکھ رہے ہیں۔ یوں بھی اُردو ادب میں "سیاسی طنز" نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میدان میں فکر تونسوی نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ مقام شاید ہی کسی کو نصیب ہو سکے۔

فکر تونسوی عام زندگی میں بیوقوفی کی حد تک معصوم آدمی نظر آتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ایسا بدھو شخص بھی اُردو کا اتنا بڑا طنز نگار ہو سکتا ہے۔ ان سے اگر آپ ملنا چاہیں تو شام کے وقت کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں چلے جائیں۔ لوگوں کی بھیڑ میں ایک شخص اپنے سیدھے پاؤں کو زمین سے گھسیٹتا ہوا نظر آئیگا۔ یہی شخص فکر تونسوی ہوگا۔ یہ اپنے اطراف ادیبوں کو جمع کرنے کے قائل نہیں ہیں، ہمیشہ چند نوجوانوں اور چند "سرداروں" میں گھرے نظر آئیں گے۔ خود تو لطیفہ نہیں سناتے مگر دوسروں کے لطیفوں پر بے ساختہ ہنستے ہیں بلکہ گھر جاکر بھی ہنستے ہیں۔ ایک دن میں نے انھیں ایک لطیفہ سُنایا۔ خوب ہنسے۔ دوسرے دن میں پھر اُن سے ملنے گیا تو دیکھا کہ اکیلے بیٹھے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "کس بات پر ہنسی ہو رہی ہے؟" کہنے لگے "کل والے لطیفہ میں تھوڑی سی ہنسی باقی تھی وہ ہنس رہا ہوں"۔ ہنسی کی اس طرح جگالی کرنے والا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

کافی ہاؤس کی بھیڑ میں جب فکر تونسوی بھیڑ کا حصہ بننے لگتے ہیں اور ایرے غیرے کی ذات میں اُترنے لگتے ہیں تو میں اکثر اوقات اپنے ذہن میں انھیں اس بھیڑ سے جُدا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اتنا بڑا ادیب بھیڑ کا حصہ کیسے بن سکتا ہے؟ اسے کہیں تو رُکنا چاہیئے۔ کبھی کبھی میں انھیں ٹوکتا ہوں تو وہ خالص پنجابی لہجہ میں کہتے ہیں ——— "او چھڈ یار! چُپ رہ، میں تاں ایسے بھیڑ دا حصہ

آں ملا ینیچ رہتا ہے"۔

کہتے ہیں "یار! اس بھیڑ میں نہ جاؤں تو کہاں جاؤں؟ اسی بھیڑ نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ میں اسی بھیڑ سے آیا ہوں اور اسی بھیڑ میں چلا جاؤں گا کیونکہ اسی بھیڑ نے مجھے اُگلا ہے۔ میں جن لوگوں کے لئے لکھتا ہوں وہ اسی بھیڑ میں رہتے ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے ادیبوں کا حصّہ تو بنا دیتے ہو۔ ادیبوں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے خول میں بند ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی انفرادیت میں گُم ہوتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنی اپنی ذات کے قلعوں میں بند ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد میں اور یہ بھیڑ دونوں ہی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ بھیڑ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔ تم لوگ بھاگ جاتے ہو"

اور میں بڑی حیران نظروں سے فکر تونسوی کو دیکھتا رہتا ہوں — یہ کیسا عجیب شخص ہے جو بھیڑ میں اپنے آپ کو ضم کرنا چاہتا ہے مگر پھر بھی بھیڑ سے کس قدر مختلف ہے ✦
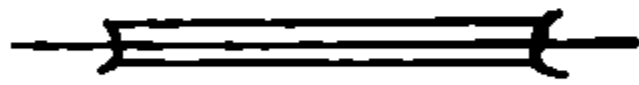
دیوان چند موہنگا خوش نویس
علی پور گرام۔ دہلی ۳۶